# جو ہم پہ گزری سو گزری

ترتیب و تالیف

ڈاکٹر سکندر زرین

پیشکش: شعبہ ابلاغ عامہ فیڈرل اردو یونیورسٹی اسلام آباد

# انتساب

نوجوان قلم کاروں کی یہ اولین صحافتی کاوش

اردو صحافت کے جدید و معتبر مورخ اور ماس کمیونیکیشن کے عظیم استاد

پروفیسر ڈاکٹر طاہر مسعود کے نام

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے

جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخی مے سے

تزئین در و بام حرم کرتے رہیں گے

اک طرز تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک

اک طرز تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

فیض

| | | |
|---|---|---|
| ڈاکٹر سکندر زرین میڈیا سٹوڈنٹس کے لئے رول ماڈل اور انسپائریشن | اقصی ریاض قریشی | 6 |
| مصنوعی ذہانت اور انسان کی بقا کا سوال | احمد حسن | 10 |
| مسئلہ فلسطین اور امتِ مسلمہ | علشباہ فواد | 13 |
| ذہن ذہنیت اور معاشرہ | اشتر حسین | 15 |
| خواتین موٹر سائیکل سوار—خود مختاری کی جانب ایک خاموش انقلاب | عائشہ حفیظ | 18 |
| حج: ""اللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ" کی صداؤں میں طے عشق کی منزلیں" | حیان احمد خان | 20 |
| نظام تعلیم | محمد اسد خان | 23 |
| عالمی سیاست میں پاکستان کا کردار | محمد بدر نعیم کھوکھر | 25 |
| آرٹیفیشل انٹیلیجنس انقلاب و چیلنجز: | محمد شکیل کھوکھر | 28 |
| پاک بھارت تعلقات اور خطے کا امن: | محمد ولید آصف | 31 |
| آخر کشمیر ہی کیوں؟ | نمرہ ظہور | 34 |
| نظریاتی غلامی: ایک خاموش زنجیر | سعد کیانی | 37 |
| جذبہ تو ہے، لیکن میدان نہیں! | سید کمیل حیدر | 39 |
| لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو | تربیہ صفدر | 41 |
| سائبر سیکیورٹی | فاطمہ مصطفیٰ | 43 |

| | | |
|---|---|---|
| وادی داریل: وہ جنت جو ابھی دریافت ہونا باقی ہے۔ | فضل حکیم | 46 |
| فیشن کے زریعے ثقافتوں کا جوڑ: پاکستانی اور مغربی فیشن کا جائزہ | حفصہ احمد | 48 |
| پاکستان میں نوجوان نسل اور سگریٹ نوشی | جاریہ زہرہ | 50 |
| بھارت پاکستان کشیدگی میں میڈیا کا کردار | کرن شاہین ستی | 53 |
| خاندانی نظام اور مغربی اثرات | نتالیہ سلیم | 55 |
| سوشل میڈیا کا استعمال اور نوجوانوں کے بدلتے رویے | ربیعہ عروج | 57 |
| میری وائی فائی میرے رشتوں سے زیادہ مضبوط کیوں ہے؟ | شانزہ گلستان | 59 |
| فٹ بال عالمی کپ کی تاریخ، یادگاری لمحات اور بڑے کھلاڑی | تابش خان | 62 |
| مسئلہ کشمیر! آخر کب تک؟ | عدنان خلیل | 65 |
| شاہد آفریدی کا گلگت بلتستان کا دورہ حقیقت کیا ہے؟ | احمد شاہ | 67 |
| نقش کہسار سرزمین ہزارہ | اریبہ حبیب عباسی | 69 |
| ایک عکس ہماری حقیقتوں کا (محنت کا سفر) | عتیقہ بتول | 75 |
| آج کے معاشرہ میں ریڈیو کی اہمیت | از قلم عطاالودود | 77 |
| گلیات کی خوبصورتی | فائزہ عباسی | 80 |
| جنت کے راستے یا جنت کا راستہ؟ شاہراہِ قراقرم پر سفر کا ایک حقیقت پسندانہ جائزہ | حسینہ اعظم | 81 |

| | | |
|---|---|---|
| پاکستان پر ماحولیاتی تبدیلی کے اثرات: چیلنجز، حکمت عملی | جواھر احمد | 83 |
| نیو ورلڈ آرڈر اور ہم (پاکستان) | ثقلین مشتاق | 86 |
| مانسہرہ—ایک خواب، ایک حقیقت | کبری وقار | 88 |
| خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے | مشرف سلیم | 89 |
| پاکستان بھارت جنگ ایک تاریخی، جذباتی اور تعمیری جائزہ | اوریم ارشاد | 91 |
| جدید فیشن اک درد سر | سلمی وحید | 94 |
| وادی تیراہ | شبیر احمد | 96 |
| سوشل میڈیا: فائدہ یا نقصان؟ | شہوار گل | 99 |
| گلگت بلتستان میں بڑھتی ہوئی بیماریاں اور انکے اسباب۔ | سہیل عباس | 101 |
| دنیا بدل رہی ہے، ہم کب بدلیں گے؟ | زہرا حسیب | 103 |
| آج کا انسان پریشان کیوں؟ | زریاب بن طاہر | 104 |

# جو ہم پہ گزری سو گزری

یہ برقی کتاب دراصل کالموں کا مجموعہ ہے۔ اور کالم نگار کوئی ایک ہی شخص نہیں، بلکہ پوری ایک جماعت بطور کالم کار اس علمی و صحافتی پروجیکٹ میں شریک عمل ہے۔ فیڈرل اردو یونیورسٹی اسلام آباد میں سمسٹر فال (خزاں) 2021 میں ماس کمیونیکیشن کا پروگرام شروع کیا گیا تھا۔ خزاں 2023 میں اسے باقاعدہ ڈیپارٹمنٹ کا درجہ دیا گیا۔ اور اب جولائی اگست 2025 میں ماس کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ کا اولین بیچ فارغ التحصیل ہو رہا ہے۔ سمسٹر بہار 2025 میں میقات ہفتم و ہشتم کا نصابی کورس "اداریہ، کالم اور فیچر نویسی" پڑھانے کی ذمہ داری میری تھی۔ اور بطور ابلاغیات کے استاد یہ میرا ایمان کی حد تک یقین ہے کہ اگر یونیورسٹی سطح پہ بچوں کو عملاً میڈیا نہ سکھایا گیا تو صرف نوٹس، بکس پڑھ کے اور پڑھا کے کچھ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ مذکورہ مضمون کی پہلی کلاس میں ہی میں نے اسکیم آف اسٹڈی بنا کے طلبہ سے سانجھا کی اور ان کو بتایا کہ اس کورس کی تکمیل کے بعد آپ سے ایک مکمل کالم نگار یا فیچر نویس بننے کی توقع نہیں کروں گا، تاہم آپ کے اندر کم از کم 20 فیصد ایک لکھاری پیدا ہو جائے تو اسی کو اپنی کامیابی سمجھوں گا۔ اور آج میں اطمینان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان طالب علم لڑکے لڑکیوں نے نہ صرف اداریہ، کالم اور فیچر جیسی صحافتی اصناف، ان کی تیکنیک، اوصاف اور طرز تحریر کو سمجھا بلکہ مختلف موضوعات سے مزین مضامین اخبارات میں شائع کروائے۔

میرے لئے ذاتی طور پر مقام صد شکر اور لمحہء فخر ہے کہ میرے شاگردوں کی صحافتی تحریریں کتابی شکل میں ڈھل رہی ہیں۔ سٹوڈنٹس جب قلم سنبھالیں اور مجھ ایسے طالب علم سے چند لفظ سیکھتے ہوئے ان کی تحریریں اخبار میں چھپ جائیں تو یہی میری محنت کا ثمر ہے اور یہی میرے ان خوابوں کی تعبیر ہے جو شاید میں نے دیکھے بھی نہیں تھے۔ یہ صرف ایک کتاب نہیں بلکہ میرے عزیز سٹوڈنٹس کے کیریر کا آغاز ہے۔ قلم و قرطاس سے ان کے رشتے کی جڑت ہے۔ باقی ان کے مضامین کے کانٹنٹ، اسلوب، ان میں کی جانے والی لفاظی اور دیگر اوصاف پر

تبصرہ قارئین پر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ میرے طالب علموں کی طالب علمانہ کاوش ہے۔ لھذا کمی کو تاہیاں ہو سکتی ہیں۔ بنیادی طور پر یہ پاکستان کی ماس کمیونیکیشن اکیڈمیہ کی جانب سے ہماری میڈیا انڈسٹری کے لیے دیا جانا والا تحفہ ہے۔ اور تحفہ ہے یہ قلم کار سٹوڈنٹس۔

میرے ہاتھ میں قلم ہے میرے ذہن میں اجالا

ڈاکٹر سکندر زرین

اسسٹنٹ پروفیسر

ماس کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ

فیڈرل اردو یونیورسٹی اسلام آباد

# ڈاکٹر سکندر زرین میڈیا سٹوڈنٹس کے لئے رول ماڈل اور انسپائریشن

اقصیٰ ریاض قریشی

میری ابلاغ عامہ (ماس کمیونیکیشن) کی بیچلرز کی ڈگری تکمیل کے مرحلے میں ہے۔ چار سال قبل جب میں نے ماس کمیونیکیشن جیسے رعب دار شعبے کے انتخاب کا فیصلہ کیا تو ذہن میں کچھ خدشات بھی تھے اور دل بھی امیدوں سے بھرا ہوا تھا۔ خدشہ یہ تھا کہ کیا چار سال کی تعلیم اور محنت کے بعد کوئی ڈھنگ کا روزگار ملے گا؟ اور امید یہ لگائی ہوئی تھی کہ چلیں ماس کمیونیکیشن پڑھ کے کچھ اپنی شخصیت نکھرے گی۔ اچھا بولنے کی صلاحیت آ جائے گی۔ ابلاغی مہارت حاصل کر لوں گی۔ بہر حال ماس کمیونیکیشن کے لئے میں نے فیڈرل اردو یونیورسٹی اسلام آباد کا انتخاب کیا۔ سچی بات ہے بیچ میں کچھ نشیب و فراز بھی آئے۔ کبھی لگا کہ میرا یہ فیصلہ غلط تھا۔ شروع شروع میں یہ بھی مسئلہ تھا کہ ہم صرف کورسز پڑھتے تھے۔ کتابی باتیں بہت تھیں۔ تھیوریز ہی پڑھائی جاتی تھیں۔ عملی کام کوئی نہیں ہوتا تھا جو کہ اس فیلڈ کا بنیادی تقاضا ہے۔ اس پر مجھ سمیت میرے ساتھی کلاس فیلوز شکوہ کناں تھے کہ یونیورسٹی میں بھی پریکٹیکل پروجیکٹس نہیں کریں گے تو عملی زندگی میں جانے کی تربیت کب ملے گی۔ ایک تو ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں وسائل کی کمی تھی۔ اور ٹی وی سٹوڈیو، ڈیجیٹل لیب، ایف ایم ریڈیو، اخبار جیسی بنیادی چیزیں ڈیپارٹمنٹ میں نایاب و ناپید ہیں۔ ایسے میں فیلڈ جرنلسٹ کے طور پہ کس طرح ہماری گرومنگ اور تربیت ہو گی؟ یہ سوال دل و دماغ میں کھٹکتا رہتا تھا۔ خیر ٹیچرز اچھے بھی ملے تھے لیکن پریکٹیکل ورک ہم کرنا چاہتے تھے اور ڈیپارٹمنٹ ایسا شروع کے سمسٹرز میں کروا نہیں رہا تھا۔

پھر ہماری خوش قسمتی یہ ہوئی کہ ڈاکٹر سکندر زرین جیسے ٹیچرز میسر آئے۔ آپ ماس کمیونیکیشن میں پی ایچ ڈی ہونے کے ساتھ ساتھ بطور فیلڈ جرنلسٹ وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ جیو نیوز سے بطور اسائنمنٹ ایڈیٹر 11 سال تک منسلک رہے ہیں۔ پچھلے 15 سالوں سے اخبارات کے لیے کالم بھی لکھ رہے ہیں۔ سوشل میڈیا پہ اپنی تپی تلی اور کاٹ دار تحریروں کے لیے بھی جانے جاتے ہیں۔ کرنٹ افیئرز، سیاست، سماجی معاملات اور میڈیا وغیرہ پہ آپ کی پوسٹس پڑھنے والوں کا ایک سرکل ہے۔ اب تو "معاملہ کیا ہے؟" کے عنوان سے پوڈکاسٹ بھی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سکندر زرین میگزین کی ادارت بھی کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ بطور فیلڈ رپورٹر اخبارات سے بھی وابستہ

رہے ہیں۔ اور ریسرچ پیپرز بھی ان کے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ گویا ڈاکٹر سکندر زرین فیلڈ جرنلزم اور اکیڈمک میڈیا ایجوکیشن کا ایک زبردست پیکج ہیں۔ اور انہوں نے اپنی تحقیق و تعلیم اور جیو نیوز اور اخبارات کے تجربے کے عین مطابق ہماری اکیڈمک ٹریننگ کا بندوست کیا۔

وہ ہائی کولیفائیڈ محقق و مدارس ہونے کے ناتے تھیوریٹیکل اسٹڈیز کو اہمیت دیتے ہی ہیں، تاہم ساتھ ساتھ پریکٹیکل کروانا ان کا اہم خاصہ ہے۔ ایسا لگتا ہے وہ کام کے بھوکے ہیں۔ اور کام کو پروجیکٹ سمجھ کے کرتے ہیں اور ٹھیک ٹارگٹ پر مشن کو مکمل بھی کر لیتے ہیں۔ اس دوران سٹوڈنٹس کو پورا پورا ٹرین بھی کر لیتے ہیں۔ "میگزین جرنلزم اینڈ پبلیکیشن" کا مضمون انہوں نے ہمیں ساتویں سمسٹر میں پڑھایا۔ ان کا انداز یہ ہوتا ہے کہ پہلی کلاس میں ہی اسکیم آف اسٹڈی خود ہی بنا کے دیتے ہیں اور پورے سمسٹر کے پریکٹیکل کام، کوئز وغیرہ تاریخوں کے ساتھ بطور پروجیکٹ بتاتے ہیں۔ اسی اصول پہ عمل کرتے ہوئے انہوں نے پہلے میگزین جرنلزم کے ضروری لیکچرز دیئے۔ پھر مجلے کے لیے مضمون کیسے لکھا جائے؟ یہ ٹھیک طریقے سے پڑھایا اور سمجھایا۔ بچوں کو تحریر کی حرمت سمجھائی، لکھاری کی اہمیت بتلائی۔ لکھنا سکھایا۔ اپنے مافی الضمیر کو زیر تحریر لانے کا سلیقہ دیا۔ اور پھر دوسرے مڈ میں کلاس کے تمام سٹوڈنٹس سے مضمون لکھوائے۔ ساتھ ساتھ میگزین کی تیاری و اشاعت کے لئے تین ٹیمیں بنائیں۔ ایڈیٹوریل بورڈ، اشاعتی ٹیم اور اشتہارات کی ٹیم۔ اس طرح سٹوڈنٹس کو لکھنے کی صلاحیت دینے کے ساتھ ساتھ پبلشنگ یعنی کتابت و اشاعت کی بھی پوری سینس دینے کی کوشش کی۔ یوں سمسٹر کے آخر تک "پہل" کے نام سے ایک زبردست میگزین چھپ کے آیا۔ ڈاکٹر زرین کی زیر ادارت شائع شدہ یہ "پہل" میگزین وفاقی اردو یونیورسٹی کے کسی بھی ڈیپارٹمنٹ کا پہلا باقاعدہ مجلہ ہے۔ میگزین کی اشاعت کے تمام مراحل میں استاد محترم کا فوکس یہ رہا کہ سٹوڈنٹس ٹیم ورک سیکھیں۔ باہمی تعاون کے ساتھ کام کرنے کے عادی ہوں۔

ڈاکٹر سکندر زرین نہایت متحرک، انرجیٹک اور اپنے دھن کے پکے نکلے ہیں۔ "پہل" میگزین کی کامیاب اشاعت کے بعد انہوں نے ڈیپارٹمنٹ کو ڈیجیٹل طرح پہ ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ سمسٹر بہار 2025 میں "ٹی وی نیوز بلیٹن" کا کورس پڑھاتے ہوئے انہوں نے ایک اور اہم ٹاسک دیا کہ جون میں ہمارا بلیٹن نشر ہو گا۔ اس مقصد کے لیے فروری مارچ میں ہی پہل نیوز چینل کو ڈیجیٹل پلیٹ فارم پہ بنایا گیا۔ پہلے مڈ کے دوران ٹی وی نیوز بلیٹن کے

تیکنیکی امور سمجھائے۔ خبر کھنگالنا، خبر نکالنا، خبر بنانا، خبر کو سنوارنا یعنی ادارت، خبری فارمیٹ، وائس اور، گویا ٹی وی نیوز کی جملہ خبری ضروریات اچھے سے بتائیں اور سکھائیں۔ بلیٹن کے لیے 45 رکنی عملہ ترتیب دیا گیا اور ہر سٹوڈنٹ کی اپنے اپنے تفویضے کے مطابق ٹریننگ کی گئی۔ پہل نیوز چینل کو ٹیسٹ ٹرانسمیشن کے طور پہ شروع کیا گیا۔ اس پر سٹوڈنٹ رپورٹرز کے پیکجز چلنے لگے۔ مجھے اینکر بننے کا موقع دیا گیا۔ یہ ڈاکٹر سکندر زرین کی مستقل مزاجی، اپنے کام میں دلچسپی اور مزاج کی تندہی ہے کہ انہوں نے نیوز بلیٹن تقریباً تیار کروا لیا ہے۔ سمسٹر ہفتم اور ہشتم کے کئی سٹوڈنٹس کو ایک طرح سے پریکٹیکل صحافی، کیمرہ پرسن، نیوز رائٹر یا پروڈیوسر بنا دیا ہے۔ اور اب 3 جون 2025 کو ماس کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ کے چینل "پہل" کی باقاعدہ افتتاحی تقریب رکھی گئی ہے۔ 3 جون سٹوڈنٹس پر مشتمل نیوز عملے کے بنائے ہوئے بلیٹن کے نشر ہونے کا دن ہے۔ یعنی ماس کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ اب بھرپور طور پہ پریکٹیکل نیوز کا ادارہ بن چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس شعبے کو ایسا رنگ ڈھنگ دیا ہے کہ اب لگتا ہے کہ یہ میڈیا پرسنز کی تربیت گاہ ہے بلکہ باقاعدہ ایک صحافی ساز ادارہ ہے۔ یاد رہے یہ سب کچھ ڈیپارٹمنٹ کی بے سروسامانی کے عالم میں کیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر سکندر زرین کا اپنا ذاتی شوق، دلچسپی اور طلبہ سے ٹیم ورک میں مفید کام لینے کی مہارت، سب کچھ اس وجہ سے ممکن ہو پایا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ پاکستان کے کسی دوسری یونیورسٹی کے ڈیپارٹمنٹ سے اس طرح باقاعدہ پروفیشنل انداز میں نیوز بلیٹن نشر ہوتا ہے۔

ڈاکٹر سکندر زرین خود ایک صحافی و لکھاری بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے طلبہ کو کالم نگار بنانے کا بھی بیڑہ اٹھایا ہے۔ "اداریہ، کالم و فیچر نگاری" کا اکیڈمک کورس بھی وہ خود ہی پڑھاتے ہیں۔ اس میں پہلے کالم نگاری کے اصول، گر، تیکنیک سکھائے۔ پھر ہر طالب علم سے کسی بھی آڈیٹ بیورو آف سرکولیشن سے منظور شدہ اخبار میں کالم شائع کروایا۔ اب ان کا ارادہ ہے کہ سٹوڈنٹس کے کالموں کا مجموعہ بطور تالیفی کتاب شائع کروایا جائے۔ یوں ماس کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ فیڈرل اردو یونیورسٹی اسلام آباد کا اپنا میگزین بھی ہو گا، ڈیجیٹل نیوز چینل بھی اور کتاب بھی۔ اس کے علاوہ ایک اخبار بھی نکالنے کا وہ ارادہ کر چکے ہیں۔ گزشتہ برس "سوشل میڈیا" کا مضمون پڑھاتے ہوئے انہوں نے بچوں سے نہایت پروڈکٹیو قسم کے پوڈ کاسٹ اور وی لاگز بھی بنوائے تھے۔ گویا اب ہمارا ڈیپارٹمنٹ بھرپور عملی صحافت یا پریکٹیکل میڈیا کا مرکز بن چکا ہے۔ سو مجھے خوشی ہے کہ چند ہفتوں بعد میں ماس کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ فیڈرل اردو یونیورسٹی اسلام آباد سے نہ صرف ڈگری لے کر نکل رہی ہوں بلکہ ایک ٹی

وی اینکر بن کے، ایک ادنی سی رائٹر کا روپ دھار کے اور ایک پریکٹیکل پروفیشنل میڈیا پرسن کی حیثیت میں فارغ ہو رہی ہوں۔ ان سب کا کریڈٹ میں اپنے دیگر ٹیچرز کے ساتھ ساتھ خاص کر ڈاکٹر سکندر زرین کو دیتی ہوں۔ بلا شبہ ڈاکٹر سکندر زرین میڈیا سٹوڈنٹس کے لئے ایک انسپائریشن ہیں۔ رول ماڈل ہیں۔

# مصنوعی ذہانت اور انسان کی بقا کا سوال

احمد حسن

بے بس انسان نے جب پہیہ ایجاد کیا، تو اسے شاید یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایک ایسا سفر شروع کر رہا ہے جو ایک دن اسے اپنی ہی ساختہ ذہانت کے سامنے بے بس کر دے گا۔ آج ہم اُس مقام پر کھڑے ہیں جہاں انسان کی ذہانت نے ایک نئی مخلوق کو جنم دیا ہے، جسے ہم ''مصنوعی ذہانت'' کہتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ نئی مخلوق انسان کی خدمتگار رہے گی یا ایک دن اسے نگل جائے گی؟

ہم ایک ایسے دور میں داخل ہو چکے ہیں جہاں مشینیں صرف کام نہیں کرتیں بلکہ سوچتی ہیں، فیصلے کرتی ہیں، اور بعض اوقات ایسا لگتا ہے جیسے وہ ہم سے بہتر سمجھتی ہیں۔ روزمرہ زندگی میں ہم جس سہولت کو انجوائے کر رہے ہیں، وہ درحقیقت مصنوعی ذہانت کی وہ ہنرمندی ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے ایک خاموش انقلاب لا رہی ہے۔ لیکن ہر انقلاب کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ سوال یہ نہیں کہ ٹیکنالوجی کہاں تک پہنچ گئی ہے، اصل سوال یہ ہے کہ انسان اس کے ساتھ کہاں کھڑا ہے؟

کبھی ہم فخر سے کہتے تھے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے کیونکہ وہ سوچ سکتا ہے، محسوس کر سکتا ہے، اور فیصلے کر سکتا ہے۔ مگر اب ایک ایپ یا پروگرام سیکنڈز میں وہ تجزیہ کر لیتا ہے جو انسان کو گھنٹوں لگتے ہیں۔ مصنوعی ذہانت نہ تھکتی ہے، نہ بیمار پڑتی ہے، اور نہ ہی جذبات میں بہک کر غلط فیصلہ کرتی ہے۔ کیا یہ سب خصوصیات انسان کے مقابلے میں اسے بہتر نہیں بناتیں؟

جب بھی کسی نئی ٹیکنالوجی نے جنم لیا، تو اس کے ساتھ خوف بھی پیدا ہوا۔ مگر مصنوعی ذہانت کا خوف صرف اس لیے نہیں ہے کہ یہ تیزی سے ترقی کر رہی ہے، بلکہ اس لیے ہے کہ یہ ''انسانی صلاحیتوں'' کی حدوں کو چیلنج کر رہی ہے۔ وہ تمام پیشے جن پر انسان فخر کرتا تھا، صحافت، وکالت، طب، تدریس، سب اب ایک ایسے دوراہے پر کھڑے ہیں جہاں ایک کوڈ یا الگورِدھم اُن کی جگہ لینے کو تیار ہے۔ ایک روبوٹ اب رپورٹر بھی بن سکتا ہے، ڈاکٹر بھی، استاد بھی اور جج بھی۔ سوال یہ ہے کہ انسان کہاں جائے گا؟ کیا وہ صرف ایک صارف بن کر رہ جائے گا؟ یا

اپنی بقا کی کوئی نئی راہ تلاش کرے گا؟ معاشی ماہرین کہتے ہیں کہ مصنوعی ذہانت لاکھوں نوکریاں ختم کر دے گی، مگر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ نئے مواقع پیدا ہوں گے۔ مگر یہ سوال کون پوچھے گا کہ کیا ہر مزدور، ہر کسان، ہر عام فرد اس نئی دنیا میں زندہ رہنے کے لیے تیار ہے؟ کیا ہمارے تعلیمی ادارے انسانوں کو صرف نوکری کے لیے تیار کر رہے ہیں یا انسانیت کے لیے؟ یہ معاملہ صرف نوکریوں کا نہیں، اقدار کا بھی ہے۔ جب ایک مشین فیصلہ کرے گی کہ کس مریض کا علاج پہلے ہونا چاہیے، یا کس قیدی کو ضمانت ملنی چاہیے، تو کیا وہ اس فیصلے میں رحم، ہمدردی یا احساسِ جرم جیسے جذبات شامل کرے گی؟ نہیں۔ کیونکہ وہ جذباتی نہیں، منطقی ہو گی۔ اور یہی وہ نکتہ ہے جہاں انسان اور مشین کا فرق خطرناک صورت اختیار کر سکتا ہے۔ مصنوعی ذہانت کی طاقت کسی ایک ملک یا کمپنی کے ہاتھ میں آجائے، تو وہ دنیا کو کنٹرول کر سکتی ہے۔ معلومات اب تلوار سے زیادہ خطرناک ہتھیار بن چکی ہے۔ جب ایک ایپ آپ کی پسند، ناپسند، رجحانات اور حتیٰ کہ ذہنی کیفیت تک کو جانتی ہے، تو وہ آپ کے فیصلے بھی بدل سکتی ہے۔ جمہوریت، آزادی، اور رائے کا حق، یہ سب کچھ مصنوعی ذہانت کے ذریعے چپ چاپ کنٹرول کیا جا سکتا ہے

مگر اس تمام اندیشے کے باوجود، اگر ہم اس ٹیکنالوجی کو سمجھداری سے استعمال کریں، تو یہ انسانیت کے لیے ایک نعمت بن سکتی ہے۔ مصنوعی ذہانت کینسر جیسی بیماریوں کی جلد تشخیص کر سکتی ہے، زلزلوں کی پیشگوئی کر سکتی ہے، تعلیم کو ہر کونے تک پہنچا سکتی ہے، اور ایسے مسائل حل کر سکتی ہے جو صدیوں سے انسان کو پریشان کیے ہوئے ہیں۔ مسئلہ خود مصنوعی ذہانت میں نہیں، بلکہ انسان کے ارادوں میں ہے۔ اگر ہم اسے کنٹرول میں رکھیں، اصولوں اور اخلاقیات کے دائرے میں رکھیں، تو یہ ہماری خدمت کرے گی۔ لیکن اگر ہم نے اسے بلا سوچے سمجھے بے لگام چھوڑ دیا، تو شاید ایک دن ہمیں اپنی بقا کا سوال بھی اس سے پوچھنا پڑے۔ ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم صرف سمارٹ مشینیں بنانا چاہتے ہیں یا ایک بہتر دنیا؟ ایک ایسی دنیا جہاں انسان اب بھی سب سے بڑا سرمایہ ہو، سب سے بڑی طاقت ہو، اور سب سے بڑی ذمہ داری بھی۔ مصنوعی ذہانت کے اس دور میں اصل چیلنج یہی ہے کہ ہم اپنی "انسانیت" کو نہ کھو دیں۔ کیونکہ اگر انسان اپنے جذبات، احساسات، اور اخلاقی شعور کو گنوا بیٹھا، تو پھر چاہے وہ کتنی ہی ذہانت سے لیس کیوں نہ ہو، وہ صرف ایک مشین ہی رہ جائے گا، چاہے اس کا جسم گوشت و پوست کا ہی کیوں نہ ہو۔

اب وقت ہے کہ ہم سوال کریں، سوچیں، اور تیاری کریں۔ کیونکہ جو آنے والا ہے، وہ صرف ایک نئی ٹیکنالوجی نہیں، وہ انسان اور مشین کے درمیان فیصلہ کن جنگ ہے۔ اور اس جنگ میں فتح صرف اُسی کی ہو گی جو اپنی "انسانیت" کو محفوظ رکھ سکے گا۔

# مسئلہ فلسطین اور امتِ مسلمہ

علشباہ فواد

آج میں آپ کی توجہ ایک اہم اور بنیادی مسئلے کی طرف مبذول کرانا چاہتی ہوں۔ جیسا کہ ہم سب کے علم میں ہے، فلسطین کی سرزمین ہم مسلمانوں کے لیے انتہائی مقدس مقام رکھتی ہے۔ یہاں بیت المقدس واقع ہے، جو مسلمانوں کا پہلا قبلہ ہے۔ کئی ماہ تک رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں مسلمان اسی قبلہ کی طرف رُخ کر کے نمازیں ادا کرتے رہے۔ یہ مقام مسلمانوں کے لیے بے حد اہمیت اور فضیلت کا حامل ہے۔

آج اسی سرزمین پر مسلمانوں پر ظلم اور بربریت کا بازار گرم ہے۔ ہماری مائیں، بہنیں، بیٹیاں اور معصوم بچے، کوئی بھی وہاں محفوظ نہیں۔ بلخصوص ہمارے نوجوانوں کو جس بے رحمی سے شہید کیا جارہا ہے، ماؤں کی گودیں اجڑ رہی ہیں، ہر طرف قتل و غارت کا ماحول ہے۔ صیہونی ریاست (اسرائیل) پوری طاقت سے، بلا خوف ہو کر مسلمانوں کا قتلِ عام کر رہی ہے۔

غزہ کے ہسپتال، مساجد، کوئی بھی جگہ محفوظ نہیں ہے، لوگوں کو خوراک اور ادویات کی شدید قلت کا سامنا ہے۔ صاف پانی تک میسر نہیں۔ معصوم بچے ذہنی اذیت اور اضطراب کا شکار ہیں۔ لوگوں کے پاس رہنے کو چھت نہ رہی، کوئی ٹھکانہ نہیں، اور وہ کھلے آسمان تلے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

صحت اور علاج کی کوئی سہولت موجود نہیں۔ لوگ تڑپ رہے ہیں، اور امتِ مسلمہ کو پکار رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آج امتِ مسلمہ کہاں کھڑی ہے؟ کیا کردار ادا کر رہی ہے؟ بحیثیت انسان، ہم اپنے ان مسلمان بھائیوں کے لیے کیا کر رہے ہیں جو روزانہ سینکڑوں، ہزاروں کی تعداد میں شہید ہو رہے ہیں؟ بحیثیت مسلمان، ہمارا کردار کیا رہا ہے؟ کیا آج کا مسلمان اتنا بے حس ہو گیا ہے کہ ایک چھوٹی سی صیہونی ریاست، امتِ مسلمہ کو بے دریغ قتل کر رہی ہے، اور 57 اسلامی ممالک صرف بیانات اور جلسوں تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں؟

کیا یہ ہمارا بنیادی دینی، انسانی اور اخلاقی فریضہ نہیں کہ ہم اپنے مظلوم مسلمان بہن بھائیوں کے جان ومال کی حفاظت کریں؟

کاش امتِ مسلمہ متحد ہو جائے، اور اپنے ذاتی و سیاسی مفادات کو پسِ پشت ڈال کر ان مظلوموں کی طرف متوجہ ہو، تاکہ اُن کی مدد کی جاسکے، اور ان کا سہارا بنا جاسکے۔ مسلمان ہونے کے ناطے، ہمیں اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لا کر اپنے فلسطینی بھائیوں کی بھرپور مدد کرنی چاہیے، جہاں غزہ کے مسلمان بدترین ظلم و ستم کا شکار ہیں۔ یقیناً، ایسے حالات انسانی ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ امتِ مسلمہ کو چاہیے کہ وہ اُن مسلمانوں کی حفاظت کرے، تاکہ کل ہم اللہ کی عدالت میں سرخرو ہو سکیں۔ اللہ ہم سب مسلمانوں کی حفاظت فرمائے۔

پاکستان زندہ باد

# ذہن ذہنیت اور معاشرہ

اشتر حسین

پاکستان میں ذہنی صحت ایک ایسا نازک اور حساس موضوع ہے جس کے بارے میں نہ بات کرسکتے ہیں اور نہ ہی سنجیدگی سے سوچا جاتا ہے۔ جسمانی بیماری ہو جائے تو فوری علاج کے بارے میں سوچا جاتا ہے، لیکن جب دل اور دماغ تھک جاتے ہیں، جب سوچیں بوجھ بن جائیں، تو کہا جاتا ہے: "حوصلہ کرو، کچھ نہیں ہوا" یا "بس وہم ہے، اللہ کا ذکر کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

بیشک دینی اور روحانی سہارا زندگی کا اہم حصہ ہے، لیکن مسئلہ تب ہوتا ہے جب ذہنی بیماریوں کو ایک کمزوری، شرمندگی یا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ یہی رویے مریض کو مزید اکیلا کر دیتی ہے، اور وہ خود اپنے خلاف ایک خاموش جنگ میں الجھ جاتا ہے۔ جب کوئی انسان ذہنی دباؤ، افسردگی یا اضطراب کا شکار ہوتا ہے، تو وہ اندر ہی اندر ایک مستقل کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ جنگ اسکی کسی اور سے نہیں، اپنے آپ سے ہوتی ہے۔ سوچیں آپس میں الجھ جاتی ہیں، ماضی کی باتیں بار بار ذہن پر ہتھوڑے کی طرح برستی ہیں، اور زندگی ایک ایسا کمرہ لگتی ہے جہاں ہر دروازہ بند ہے۔

یہ کیفیت خاص طور پر اُس وقت شدید ہو جاتی ہے جب انسان نے اپنے ماضی میں ایسے زخم سہے ہوں جس کا درد وقت کے ساتھ ختم ہونے کے بجائے اندر ہی اندر بڑھتا جاتا ہے۔ بچپن میں اگر پیار نہ ملا ہو، اگر والدین یا گھر والوں کا رویہ سرد رہا ہو، یا زندگی میں کسی عزیز کی بے وقت جدائی نے دل پر گہرا اثر چھوڑا ہو—تو یہ سب یادیں انسان کے دماغ میں ایک ایسا شور پیدا کر دیتی ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وقت ہر زخم کا مرہم ہے، لیکن کچھ زخم ایسے ہوتے ہیں جو وقت کے ساتھ گہرے ہو جاتے ہیں۔ ایک بچہ جو مسلسل تنقید کا نشانہ بنتا رہا ہو، وہ بڑا ہو کر خود اعتمادی سے محروم ہو سکتا ہے۔ ایک نوجوان جسے کسی اہم رشتے میں دھوکہ ملا ہو یا کسی قریبی شخص کا اچانک زندگی سے چلے جانا، وہ زندگی بھر اس خلا کو محسوس کرتا رہتا ہے چاہے ظاہری طور پر وہ نارمل ہی کیوں نہ لگے۔

ایسے صدمے انسان کے ذہن میں مستقل سوالات پیدا کرتے ہیں: "اخر میں ہی کیوں؟"، "کاش میں کچھ کر سکتا"، یا "میری زندگی کی کوئی اہمیت نہیں۔" یہ سوالات آہستہ آہستہ انسان کو اکیلا پن، خوف اور الجھنوں میں دھکیل دیتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ذہنی بیماری کو اکثر شرمندگی کا باعث سمجھا جاتا ہے۔ اگر کوئی ماہرِ نفسیات کے پاس جانا چاہتا ہے، تو اسے یہ بول کے روک دیا جاتا ہے کہ "پاگلوں کے ڈاکٹر کے پاس کیوں جا رہے ہو؟" یا "نماز پڑھو، دل کو سکون ملے گا۔"

ایسی باتیں کرنے والوں کی نیت بری نہیں ہوتی، لیکن لاعلمی خطرناک ہوتی ہے۔ جب کسی کو نفسیاتی مسئلہ ہو تو اس کو سنبھالنے کے لیے صرف مشورے نہیں بلکہ سمجھنے والے لوگ چاہیے ہوتے ہیں۔ بدقسمتی سے، ہمارے ہاں سننے کا حوصلہ بہت کم لوگوں میں ہے۔ یہ خاموشی سب سے زیادہ نقصان دہ اس وقت ہو جاتیں جب جو بات کہنی ہو وہ دل میں رہ جاتی ہے۔ جو آنسو بہنے چاہییں، وہ اندر ہی اندر رہ جاتے ہیں۔ اور جو تکلیف بانٹی جا سکتی تھی، وہ انسان کو اندر سے توڑ دیتی ہے۔

سب سے پہلے ہمیں یہ ماننا ہو گا کہ ذہنی صحت، جسمانی صحت کی طرح حقیقی ہے۔ جیسے دل یا گردے کی بیماری کا علاج ضروری ہوتا ہے، ویسے ہی دماغ کے مسائل کو بھی سنجیدگی سے لینا ہو گا۔ ماہر نفسیات سے بات کرنا کوئی شرمندگی کی بات نہیں، بلکہ یہ ایک بہادر اور باشعور قدم ہوتا ہے۔

اس کے ساتھ معاشرے میں ایسے ماحول کو فروغ دینا ہو گا جہاں ہمدردی، برداشت اور سننے کا جذبہ موجود ہو۔ اگر کوئی اپنا درد بانٹنے آئے تو اسے "مشورے" دینے کے بجائے صرف سنا جائے۔ اکثر ایک سادہ سا "میں تمہیں سمجھتا ہوں" کسی کی زندگی بچا سکتا ہے۔

پاکستان میں ذہنی صحت کا بحران ماضی کے زخموں، سماجی رویوں، اور لاعلمی کے امتزاج سے پیدا ہوا ہے۔ یہ ایک ایسی خاموش جنگ ہے جو بہت سے لوگ ہر روز لڑتے ہیں، لیکن ان کے چہروں سے کچھ ظاہر نہیں ہوتا۔ ہمیں اس خاموشی کو توڑنا ہو گا، ایک دوسرے کا ہاتھ تھامنا ہو گا، اور زندگی کو جینے کے قابل بنانا ہو گا۔

یاد رکھیں، ذہنی سکون کوئی عیش نہیں بلکہ یہ ایک بنیادی انسانی حق ہے۔ اگر ہم ایک اچھا معاشرہ چاہتے ہیں، تو ہمیں ذہنی صحت کو اسی اہمیت سے دیکھنا ہو گا جس سے ہم دل، جگر یا پھیپھڑوں کو دیکھتے ہیں۔

تو بس اب خاموشی توڑیں، بات کریں اور اگر کوئی آپ سے بات کرنا چاہے، تو صرف سنیں ہو سکتا ہے آپ کی توجہ کسی کی جان بچا لے۔

# خواتین موٹر سائیکل سوار—خود مختاری کی جانب ایک خاموش انقلاب

عائشہ حفیظ

پاکستان کی سڑکوں پر ایک نیا منظر ابھر رہا ہے۔ دوپٹے ہوا میں لہراتے، خود اعتماد چہروں کے ساتھ، خواتین موٹر سائیکل چلاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کبھی جس معاشرے میں موٹر سائیکل صرف مردوں کا ذریعۂ نقل و حمل سمجھا جاتا تھا، اب وہیں خواتین اس میدان میں قدم رکھ کر ایک خاموش مگر پر اثر انقلاب لا رہی ہیں۔ کراچی کی رہائشی سارہ، جو ایک اسکول ٹیچر ہیں، روزانہ اپنی موٹر سائیکل پر 15 کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے اسکول جاتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں:

"میں نے یہ فیصلہ اپنی بیٹی کے لیے کیا، تاکہ وہ دیکھے کہ عورتیں بھی اپنے راستے خود بنا سکتی ہیں۔"

اسی طرح لاہور کی مریم، جو ایک یونیورسٹی اسٹوڈنٹ ہیں، نہ صرف خود موٹر سائیکل چلاتی ہیں بلکہ دیگر لڑکیوں کو بھی تربیت دیتی ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ یہ صرف سواری نہیں، بلکہ عورت کے بااختیار ہونے کی علامت ہے۔خواتین موٹر سائیکل سواروں کو کئی رکاوٹوں کا سامنا ہوتا ہے۔ سماجی تنقید، سڑکوں پر ہراسانی، اور انفراسٹرکچر کی کمی جیسے مسائل ان کے لیے سفر کو مشکل بنا دیتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ انسٹاگرام پر "Girls on Bike" Pakistan" نامی ایک پیج ہزاروں خواتین کو متاثر کر رہا ہے۔ وہاں ویڈیوز، تصاویر اور کہانیاں نہ صرف متاثر کن ہوتی ہیں بلکہ وہ خواتین کو یہ احساس دلاتی ہیں کہ وہ اکیلی نہیں۔

نہ روک سکو گے ان قدموں کو اب،

یہ چل پڑی ہیں، تھام کے خواب سب۔ خواتین کی موٹر سائیکل سواری صرف نقل و حرکت کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک سماجی علامت ہے۔ یہ آزادی، خوداعتمادی اور برابری کی نمائندہ ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم ان بہادر خواتین کو سراہیں، ان کے راستے آسان بنائیں اور ان کی حوصلہ افزائی کریں۔

نئ صبح کی پہلی کرن ہیں یہ لڑکیاں،

چراغ بن کے جلتی ہیں، رہ گزر بناتی ہیں

# حج: ""اللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ" کی صداؤں میں طے عشق کی منزلیں"

**حیان احمد خان**

حج صرف فرض عبادت ہی نہیں، یا محض صرف ایک سفر ہی نہیں، بلکہ یہ رب کائنات کے حضور سجدہ ریز ہونے کا نام ہے۔ اللہ کے ہاں رضامندی کے اظہار، رب کی بارگاہ میں عجز و انکساری میں جُھک جانے کا نام، یہاں تک کہ بارگاہِ الٰہی میں سب کچھ قربان، حتیٰ کہ اپنی جان سے بھی زیادہ قریب تر کو اپنے رب کے نام پر قربان کر دینے کا نام حج ہے۔ ان سب کو خالصتاً رب العزت کی رضا کے لیے ہی کرنے کا نام حج ہے، اور پھر سفر عشق کی ابتداء ہے۔ بس یہی عشقِ حقیقی ہے، یہی عشقِ الٰہیہ ہے، یہ حقیقی عشق کی منازل ہیں۔

اللہ رب العزت کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں انسان بنایا اور اشرف المخلوقات بھی کہا، اور خاص رب کا کرم کہ اُس نے اپنے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اُمتی ہونے کا شرف بخشا۔

حج اسلام کا پانچواں رکن ہے، جو ہر صاحبِ استطاعت مسلمان پر فرض کیا گیا ہے۔

قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر حج کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے، جبکہ احادیثِ مبارکہ میں حج کے مختلف مناسک اور مقامات کے فضائل بیان کیے گئے ہیں۔ یہ ایک ایسی عظیم و بابرکت عبادت ہے جو انسان کے نفس کو روحانیت سے روشناس کرتی ہے، اور جسمانی خرافات و بالیات سے پاک کر دیتی ہے۔ حج کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ رب تعالیٰ نے اپنے منتخب کردہ، برگزیدہ خاص دوست اور رسولوں کے لیے کچھ خاص سنتیں مقرر فرمائیں، جن کی پیروی حج کے دوران لازم ہے۔ اِن سنتوں کو ترک کرنا حج کو ناقص کر دیتا ہے۔

تمام خلقِ خدا جب ایک ہی لباس یعنی احرام میں ملبوس ہو کر ربِ ذوالجلال کے حضور حاضر ہوتی ہے، تو "لبیک اللہم لبیک" کی صدائیں گویا یہ اعلان کر رہی ہوتی ہیں کہ آج ہم تیرے دربار میں متحد ہو کر حاضر ہیں۔ ہماری زبانیں، ثقافتیں، مسالک اور فرقے سب جُدا جُدا ہی سہی، لیکن آج ہم سب کچھ پیچھے چھوڑ آئے ہیں، آج

ہم صرف تیرے بندے ہیں، ایک لباس میں، ایک ہی جذبے کے ساتھ، تیرے حضور التجائیں کر رہے ہیں۔ ہماری خطاؤں کو درگذر فرما کر ہمیں معاف فرما۔

یہ حسین منظر اتحاد، اخوت اور ملن سازی کا عملی نمونہ پیش کر رہا ہوتا ہے، جہاں ہر دل فقط مغفرت کا طلبگار، اور ہر آنکھ اپنے رب کی معرفت میں محو ہے۔ "طوافِ کعبہ" جیسے بیت اللہ کو خواب میں دیکھنے کی تعبیر ہو جانا ہے۔ بلاشبہ حج کے تمام ارکان اپنی جگہ عظیم مرتبہ رکھتے ہیں، مگر طوافِ کعبہ کے لمحات کچھ اور ہی شان رکھتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب انسان اپنے رب کے گھر کے گرد گھومتے ہوئے صرف عبادت نہیں کرتا، بلکہ روح کی گہرائیوں سے جُڑ کر ایک ایسا تعلق قائم کرتا ہے جو دنیا کی ہر حقیقت سے الگ تھلگ ہوتا ہے۔ وہ مناظر، جو برسوں تک صرف تصاویر میں دیکھے، قصے کہانیوں میں سنے، اور خوابوں میں بسائے، آج وہ حقیقت بن کر آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں۔ دل کی کیفیت بیان سے باہر ہو جاتی ہے، اور انسان اپنی قسمت پر رشک کرنے لگتا ہے کہ رب نے اسے اپنے گھر کا مہمان بنالیا ہے۔ پھر کسی نے کیا خوب کہا:

" جسے چاہا در پہ بلا لیا،

جسے چاہا اپنا بنا لیا"

یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ یہ سفر عمرہ کا ہو یا حج کا جو بظاہر بہت تھکا دینے والا بھی ہوتا ہے، جسمانی لحاظ سے کئی گھنٹوں پر محیط ہوتا ہے۔ لیکن جیسے ہی پہلی نگاہ بیت اللہ پر پڑتی ہے، تو ساری تھکاوٹ بھول جاتی ہے۔ دیکھتے ہی ساتھ جیسے روح تازہ دم ہو گئی ہو، جسم کی ساری تھکن جیسے اتر گئی ہو، اور دل بے ساختہ پکار اٹھتا ہے:

"لایا کہاں مجھ کو میرا مقدر، اللہ اکبر، اللہ اکبر!"

حج، دراصل، ظاہری سفر سے زیادہ ایک باطنی اور روحانی سفر ہے، جو بندے کو اُس کے رب کے قریب لے جاتا ہے، وہ لمحہ صرف آنکھوں کا دیدار نہیں ہوتا، وہ دل کی آنکھوں سے جنت کی جھلک ہوتا ہے۔

حج کے اہم ارکان میں سے ایک "رمی جمرات" بھی دراصل جہاد بالنفس کا عملی مظہر ہے، جہاں بندہ شیطان کو کنکریاں مار کر اپنے نفس، گناہوں اور برائیوں کو رد کرنے کا عہد کرتا ہے، اور فقط اطاعتِ الٰہی میں اعلانیہ طور پر اور عملی طور پر شیطان سے براءت کا مظاہرہ کر رہا ہوتا ہے۔

یوں تو حج کا ایک ایک لمحہ ہی نہایت پر وقار اور بابرکت ہوتا ہے۔ منیٰ سے مزدلفہ کا سفر، عرفات کا خطبہ سننا، کنکریاں جمع کرنا، رمیِ جمرات کرنا، قربانی دینا، حلق یا قصر کروانا، اور کھلے آسمان تلے رات گزارنا — یہ سب مناسکِ حج کا حصہ ہیں، جن میں ہر لمحہ بندے کو اللہ کے قریب تر لے جاتا ہے۔

دعا ہے رب تعالی ہم سب کو جلد از جلد اپنے در اور اپنے حبیب صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے دربار کی حاضری نصیب فرمائے، الٰہی آمین

# نظام تعلیم

محمد اسد خان

ہمیں ایک کتابی کیڑا بنا دیا گیا ہے جو کہ ایک گدھے گھوڑے کی ریس کی طرح ہے کہ اگر آپ یہ کرو گے تو اچھے مارکز ملیں گے، اچھے گریڈ ملیں گے کیونکہ یہ کتاب، یہ الفاظ، یہ آپ کے مستقبل نہیں دیکھ سکتی نہ آپ کا مستقبل بنا سکتی ہے، نہ سوال سکتی ہے موجودہ حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے جو کہ ہمارے تعلیمی نظام کا حال ہے اور یہ اس کو بہتری کی طرف کرنے کے لئے ہمارے حکومتی ہماری تعلیمی اداروں، ہمارے احساظ و قرآن کو زیادہ پڑھانے کا طریقہ، زیادہ تعلیمی نظام بدلنا پڑے گا جو کہ اس سے بہت ہٹ کے جس طرح کہ آپ کے ارد گرد کی ممالک یعنی چین ہے، ترقی آفتہ ممالک جو کہ تعلیم، جس طرح کی تعلیم دے رہے ہیں جس طرح اپنے بچوں کو گروم کر رہے ہیں اُن کی پہلے بیس دناتے ہیں اسی بیس کے دوران اپنے بچوں کو اتنا سکل فل کر دیتے ہیں ہر بات میں اتنی معارت، ہر چیز میں اتنی معارت دے دیتے ہیں کہ اُن استاذہ کو پتہ لگ جاتا ہے کہ یہ بچہ اس فیلڈ میں آگے جانے سے اس کی سیکسیس ہے تو وہ اس فیلڈ کی طرف اُس سے روانہ کر دیتے ہیں ہمیں یہاں تک کہ گریجویشن کرتے ہوئے تک معلوم نہیں ہوتا لہٰذا ہماری حکومت کو یہ اقدام لازمی اٹھانا چاہئے کہ ہماری ملک کی تعلیمی نظام کو بدل کر ایڈوانسٹ تعلیمی نظام کی طرف لانا چاہئے ابھی تک تعلیمی اداروں میں دس سال، بیس سال قرآنی کتابیں چل رہی ہیں اس کتابوں سے ہٹ کے ہمیں ایک نئ تعلیم کی طرف لانا چاہئے جیسے کہ آپ روز ملک کی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ ایک بچے کے جسم پر یعنی اس کی بیگ میں جو کتابوں کا وزن ہوتا ہے وہ بچوں کی جسمانی وزن سے بہت زیادہ ہے یعنی صرف تعلیمی کتابیں اندر بلیوی باقی کچھ بھی نہیں یعنی پیسے بٹورنے کے ایک سے ایک طریقے بنائے گئے ہیں اور یہ جتنی بھی موجودہ تعلیم جو پاکستان میں بچوں کو پڑھائی جارہی ہے وہ ہماری موجودہ پریکٹیکل لائف میں بلکل زیرو ہے یعنی اس کی کوئی ورڈ کوئی ویلیو نہیں یعنی ایک ادارہ میں آپ جاتے ہیں تو وہ آپ کی کسی کام نہیں آتی یعنی بلکل زیرو میری نظر میں اس کی ویلیو کچھ بھی نہیں تو ہمیں اپنے تعلیمی اداروں کو آگاہ کرنا چاہئے کہ وہ ہماری تعلیمی نظام

کو بدلیں اس میں تبدیلی لائیں تا کہ جو آنے والی نسلیں ان کے لئے بہتر ہی کی جائیں ہماری آنے والی نسل کے لئے بہتر ہو کہ ہمارا پاکستانی نوجوان پھر باہر نہ جائے اور جو ک کے موقع کاروبار کے موقع دیے جائیں جوانوں کو تا کہ وہ دن بہ دن ترقی کرے اگر ہمارے جوان کامیاب ہوں گے تو ہمارے ملک کامیابی کی طرف رجوع ہو گا میں یا کس مضمون میں اپنی ڈگری لیں یا کیا کریں۔

# عالمی سیاست میں پاکستان کا کردار

محمد بدر نعیم کھوکھر

پاکستان کا عالمی سیاست میں ایک منفرد مقام ہے۔ پاکستان کی سیاست، معیشت اور خارجہ پالیسی کے فیصلے نہ صرف جنوبی ایشیا کے استحکام کو متاثر کرتے ہیں بلکہ ان کا اثر عالمی سطح پر بھی محسوس کیا جاتا ہے۔ پاکستان نے عالمی فورمز پر مختلف چیلنجز کا سامنا کیا ہے اور اس کے اثرات عالمی سیاست پر مرتب ہوئے ہیں۔ پاکستان نے ہمیشہ عالمی سیاست میں اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے ایک متوازن خارجہ پالیسی اختیار کی ہے۔

عالمی سیاست میں پاکستان کا کردار دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے۔ ایک متوازن، دوراندیش اور فعال خارجہ پالیسی ہی پاکستان کو عالمی سطح پر ایک باوقار اور مؤثر ریاست کے طور پر اجاگر کر سکتی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ پاکستان اپنی جغرافیائی اہمیت کو معاشی اور سفارتی طاقت میں تبدیل کرے اور عالمی سیاست میں اپنی موجودگی کو مزید مضبوط بنائے۔ پاکستان کو اپنی سفارتی پوزیشن کو مزید مضبوط بنانے کے لیے داخلی استحکام، معاشی اصلاحات اور دہشت گردی کے خلاف مستقل جدوجہد جاری رکھنی ہوگی۔ دنیا بدل رہی ہے اور پاکستان کو نئی عالمی صف بندیوں میں اپنی جگہ متعین کرنی ہوگی۔ موسمیاتی تبدیلی، عالمی تجارتی جنگیں، اور مصنوعی ذہانت جیسے ابھرتے ہوئے عالمی مسائل میں پاکستان کی شمولیت اس کی سفارتی شناخت کو وسعت دے سکتی ہے۔

پاکستان کی جغرافیائی پوزیشن اسے عالمی سیاست میں بھی ایک اسٹریٹیجک مقام عطا کرتی ہے۔ یہ ملک ایک طرف مشرق وسطیٰ، جنوبی ایشیا اور چین کے ساتھ سرحدی تعلقات رکھتا ہے تو دوسری طرف ایران اور افغانستان کے ساتھ بھی اس کی سرحدیں مشترک ہیں۔ امریکا اور چین جیسے عالمی طاقتوں کے درمیان توازن برقرار رکھنے کے لئے پاکستان کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ اسکے علاوہ پاکستان کا تعلق مشرق وسطیٰ کے ممالک خاص طور پر سعودی عرب اور ایران کے ساتھ ہے جو اسے اس خطے میں ایک مرکزی کردار فراہم کرتا ہے۔ امریکا کے ساتھ اس کی

شراکت داری اور چین کے ساتھ اس کے بڑھتے ہوئے اقتصادی تعلقات اس کی خارجہ پالیسی کا ایک اہم حصہ ہیں۔

پاکستان کی چین کے ساتھ چین پاکستان اقتصادی راہداری (CPEC) نہ صرف دونوں ملکوں کے مفاد میں ہے۔ بلکہ یہ پورے خطے کے لئے ترقی کے نئے راستے کھولتا ہے۔ پاکستان نے عالمی سطح پر ہمیشہ اپنے اصولوں پر کھڑے ہو کر فیصلہ سازی کی ہے چاہے وہ کشمیر کا مسئلہ ہو یا افغانستان کی صورتحال پاکستان کی خارجہ پالیسی میں ہمیشہ قومی خود مختاری، علاقائی استحکام اور عالمی امن کو ترجیح دی گئی ہے کیونکہ عالمی سیاست میں پاکستان کی کامیابی اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اپنی خارجہ پالیسی میں کس حد تک توازن برقرار رکھتا ہے۔

پاکستان کا داخلی استحکام عالمی سیاست میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ چونکہ سیاسی استحکام، اقتصادی بحران اور دہشتگردی و سیکورٹی مسائل نے پاکستان کی عالمی ساکھ کو متاثر کیا ہے لہذا ممکنہ طور پر پاکستان اپنے داخلی مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے تو عالمی سطح پر اس کی طاقتور موجودگی ممکن ہو گی۔ پاکستان کی فوجی طاقت اور جوہری ہتھیار عالمی سیاست میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں جس سے کافی حد تک پاکستان کی دنیا میں دھاک بھی بیٹھی ہوئی ہے جو کہ پاکستان کی دفاعی طاقت کا منہ بولتا ثبوت ہے اور اس سے پاکستان کی سالمیت و خود مختاری مزید مضبوط ہوئی ہے۔

پاکستان کو خارجہ پالیسی اقوام متحدہ، عالمی اقتصادی فورمز اور دیگر عالمی فورمز پر مضبوط اور مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔ جس سے عالمی سطح پر اپنی آواز مزید مؤثر طریقے سے بلند کر سکے۔ پاکستان نے عالمی سطح پر ہمیشہ امن اور استحکام کے لئے اپنی آواز بلند کی ہے خاص طور پر کشمیر کے مسئلے پر پاکستان نے اپنا موقف ہمیشہ احسن انداز سے پیش کیا اور عالمی برادری سے بھی اس مسئلے کے حل پر بات کرتا آیا ہے اس کے ساتھ ساتھ افغانستان

میں بھی پاکستان نے امن کے قیام کے لئے اہم کردار ادا کیا ہے اور دنیا کو بتایا کہ جنوبی ایشیا میں امن اور استحکام کا راستہ پاکستان سے ہی گزرتا ہے۔

پاکستان نے غزہ کے مسلمانوں کے حق میں بھی آواز اٹھائی ہے اور عالمی فورمز میں یہ مسئلہ بھی رکھا کہ فلسطینی مسلمانوں پر ظلم و جبر روکا جائے اور نسل کشی سے اجتناب کیا جائے کیونکہ جینے کا حق سب کو ہے لہذا

عالمی سیاست میں پاکستان کا کردار صرف اسکی جغرافیائی اہمیت پر ہی نہیں بلکہ اسکی توانائی، اقتصادی استحکام اور عوامی حمایت پر بھی منحصر ہے اور پاکستان نے اگر فعال، متوازن اور پائیدار پالیسی اختیار کی تو یہ نہ صرف اپنے مفادات کا تحفظ کرے گا بلکہ عالمی سطح پر امن، ترقی اور استحکام کے قیام میں اہم کردار ادا کرے گا۔اسی حوالے سے پاکستان کے عالمی سیاست میں صاف اور واضح کردار پر یہ شعر کردار کے زاویے میں دیکھا جاسکتا ہے۔

وہ چاند ہے تو عکس بھی پانی میں آئے گا

کردار خود ابھر کے کہانی میں آئے گا

اقبال ساجد

# آرٹیفیشل انٹیلیجنس انقلاب و چیلنجز:

محمد شکیل کھوکھر

آرٹیفیشل انٹیلیجنس یا مصنوعی ذہانت یہ وہ انقلاب ہے جس کی بدولت آج مشینوں کو انسانوں کی طرح سوچنے، سیکھنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت ملی ہے۔ آرٹیفیشل انٹیلیجنس صرف سائنسی فلموں کا تصور ہی نہیں رہا بلکہ یہ ہماری روزمرہ زندگی میں شامل ہو چکا ہے جس میں موبائل فونز میں موجود اسمارٹ اسسٹنٹس ہوں، بینکوں میں فراڈ ڈیٹیکشن سسٹمز، یا ہسپتالوں میں بیماریوں کی جلد تشخیص، تعلیمی ادارے، صنعتیں اور حتیٰ کہ زراعت بھی اس سے مستفید ہو رہی ہے۔

دنیا میں آرٹیفیشل انٹیلیجنس کا انقلاب بہت تیزی سے قدم جماتا جا رہا ہے یہ ایک ایسا انوکھا انقلاب ہے جو ہمارے روزمرہ کے کاموں کو بدلنے کے ساتھ ساتھ ایک نئی نوعیت کی فکری اور معاشی تبدیلیاں بھی لاتا جا رہا ہے۔ ہم ترقی کے اس دہانے پر کھڑے ہو چکے ہیں جہاں مشینیں نہ صرف ہماری مدد کر رہی ہیں بلکہ خود بھی بھرپور سوچنے، سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ آرٹیفیشل انٹیلیجنس آج ہمارے درمیان حقیقت بن کر موجود ہے اور ہر شعبے میں اس کے اثرات واضح ہیں صحت، تعلیم، صنعت، کاروبار، زراعت اور دفاع میں آرٹیفیشل انٹیلیجنس کی مدد سے کام کرنے کے نئے طریقے اپنائے جا رہے ہیں۔ صحت کے شعبے میں آرٹیفیشل انٹیلیجنس بیماریوں کی بروقت تشخیص، علاج کی پلاننگ اور مریضوں کی نگرانی میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

آرٹیفیشل انٹیلیجنس نے تعلیم کے کئی پہلوؤں کو آسان، تیز اور زیادہ مؤثر بنا دیا ہے۔ آرٹیفیشل انٹیلیجنس کی مدد سے خودکار لرننگ پلیٹ فارمز، سمارٹ کلاس رومز اور ذاتی نوعیت کے لرننگ سسٹمز کے ذریعے طالبعلموں کو انکی رفتار دلچسپی اور صلاحیت کے مطابق تعلیم دی جا رہی ہے۔ روزگاری صنعتی میدان میں مشینیں خودکار طور پر پیداوار کے عمل کو بہتر بنا رہی ہیں اسکے ساتھ ساتھ کاروباری شعبے میں آرٹیفیشل انٹیلی جنس مارکیٹنگ کسٹمر سروس

اور منافع بڑھانے میں مدد گار ثابت ہو رہا ہے۔ آرٹیفیشل انٹیلی جنس کا انقلاب اپنی جگہ لیکن اسکے چیلنجز بھی اسی کے ساتھ ہی ہیں جنہیں قطعی طور پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جس میں سب سے اہم مسئلہ ملازمتوں کا نقصان ہے کیونکہ جب مشینیں انسانوں کی جگہ لے لینگی تو اس کا نقصان روز گار پر پڑیگا خود کار مشینوں کی بدولت نقصان روز گاری والے افراد کو اٹھانا پڑیگا لہذا یہ ایک سنگین مسئلہ بن سکتا ہے جو کہ آئندہ مستقبل میں ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔

مزید یہ کہ آرٹیفیشل انٹیلیجنس کے چیلنجز میں ڈیٹا کی حفاظت اور اخلاقیات بھی اسی زمرے میں آتے ہیں جس میں ہمارے نجی معاملات بھی آتے ہیں یہ بھی ایک چیلنج ہے۔

آرٹیفیشل انٹیلیجنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی اقدار احساس، اور انصاف کے اصولوں کو بھی ترقی دینا ہو گی۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ مشینیں تیز ہو سکتی ہیں اور ہوشیار بھی ہو سکتی ہیں، مگر وہ انسانی ہمدردی اور بصیرت کی جگہ کبھی نہیں لے سکتیں۔

وقت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہمیں یہ بھی سمجھنا ہو گا کہ آرٹیفیشل انٹیلیجنس اب ہمارے حال کا حصّہ بن چکی ہے اگر ہم نے اپنی نسل کو اب بھی اس انقلابی ٹیکنالوجی کے بارے میں آگاہی دینے میں کوئی کوتاہی برتی تو پاکستان اس ٹیکنالوجی میں دنیا کے ساتھ ترقی نہیں کر سکے گا اسی لئے اس آرٹیفیشل انٹیلیجنس کے متعلق تعلیم بھی دینی چاہیے اور اس کے فائدے مند استعمال کے لئے کوششیں کرنی چاہیے تاکہ آنے والی نسل یہ کے لئے ٹیکنالوجی سود مند ثابت ہو اور آرٹیفیشل انٹیلیجنس کے انقلاب کے ساتھ ساتھ اسکے چیلنجز و نقصانات سے بچنے کے لئے بھی مناسب سدباب کئے جائیں جو فائدے کا سودا ہو۔

علاوہ ازیں آرٹیفیشل انٹیلیجنس کا دور شروع ہو چکا ہے اور یہ ففتھ جنریشن وار سے بھی کہیں زیادہ تباہ کن ہے۔ ہمیں آرٹیفشل انٹیلی جنس کو سنجیدگی سے سیکھنا اور سمجھنا ہو گا۔ اپنے کاموں میں اس کا استعمال بے حد

ضروری ہے ورنہ دشمن ایسی جگہ سے وار کرے گا کہ ہم حیران و پریشاں ہو جائینگے۔ اسی لئے خود کو طاقتور بنانے کے لئے ہمیں اپنی صلاحیتوں کو بھی بڑھانا ہو گا اور دشمن کی ہر چال سے مقابلہ کرنے کے لئے خود کو مضبوط بھی کرنا ہو گا۔

پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک کو انقلابی ٹیکنالوجی آرٹیفیشل انٹیلی جنس سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور اپنی نوجوان نسل کو ایک جامع حکمت عملی کے تحت اس ٹیکنالوجی سے روشناس کرواتے ہوئے ماہر بنانا چاہیے جس سے ملک پاکستان کی ٹیکنالوجی اور سائنس کے شعبوں کے ساتھ ساتھ دیگر شعبوں میں بھی ترقی و سرفرازی ہو۔

چونکہ آرٹیفیشل انٹیلیجنس کا مستقبل ہمارے ہاتھ میں ہے لہذا ہمیں ٹیکنالوجی تو سیکھ ہی لینی چاہیے لیکن سماجی اور اخلاقی معاملات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس ٹیکنالوجی کو توازن کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے جس سے بھرپور فائدہ حاصل کیا جائے اور چیلنجز کا بھی مقابلہ جواں مردی سے کیا جائے۔

زمانہ عہد میں اِسکے ہے محوِ آرائش

بنائینگے اور سِتارے آسماں کے لئے۔

مرزا اسد اللہؒ خاں غالب

# پاک بھارت تعلقات اور خطے کا امن:

محمد ولید آصف

جنوبی ایشیا کا شمار دنیا کے ان خطوں میں ہوتا ہے جہاں کشیدگی، غربت، اور تنازعات نے ترقی کی راہوں کو مسلسل پست ہی رکھا ہے۔ اس خطے کے دو بڑے ممالک پاکستان اور بھارت نہ صرف جغرافیائی اعتبار سے قریب ہیں بلکہ تاریخی، ثقافتی، اور تہذیبی طور پر بھی ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ تاہم قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک ان دونوں ممالک کے تعلقات میں کشیدگی، جنگیں اور بداعتمادی مسلسل دیکھنے کو ملتی رہتی ہے جس کی وجہ سے نہ صرف دونوں ممالک کی ترقی کو مسائل درپیش رہتے ہیں بلکہ پورے خطے کا امن بھی خطرے میں رہتا ہے۔

پاکستان اور بھارت کے تعلقات کی بنیادی وجہ مسئلہ کشمیر ہے۔ جو گزشتہ سات دہائیوں سے دونوں ممالک کے درمیان ایک بہت ہی سنگین مسئلہ چلا آرہا ہے۔ اسی مسئلے کی وجہ سے دونوں ممالک آپس میں جنگیں بھی لڑ چکے ہیں 1965 اور 1971 میں دونوں ملکوں کے درمیان جنگیں ہوئیں اور اسی کے ساتھ ایک اور کارگل کی جنگ بھی سنگین شکل اختیار کر گئی تھی۔ اسی وجہ سے پاکستان اور بھارت کے تعلقات ایک طویل تاریخ بھی رکھتے ہیں جو جنگوں، تنازعات اور سیاسی پیچیدگیوں سے بھری ہوئی ہیں۔ پاکستان اور بھارت دونوں ممالک کا تعلق نہ صرف جنوبی ایشیا بلکہ عالمی سطح پر بھی نہایت اہمیت کا بھی حامل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دونوں ممالک کی سرحدیں دنیا کی سب سے طویل اور متنازعہ سرحدوں میں شمار ہوتی ہیں۔

پاکستان اور بھارت دونوں ممالک کی دشمنی نہ صرف ان کی داخلی سیاست اور معاشی ترقی کو متاثر کرتی ہے بلکہ پورے خطے کے امن اور استحکام کے لئے ایک سنگین خطرہ ہے۔ جو کہ حالیہ دنوں میں دیکھنے کو بھی ملا اور بات جنگ سے شروع ہو کر جنگ بندی تک پہنچ کر ختم ہوئی اس جنگ کی وجہ بھارت خود ہی تھا کیونکہ اسکے الزام کی وجہ سے بھارت نے جان بوجھ کر پاکستان کی حدود میں داخل ہونے کی کوشش کی تو پاکستانی افواج نے بھارت کو ایسا منہ توڑ

جواب دیا کہ بھارت کو اس قدر منہ کی کھانی پڑی کہ بات جنگ بندی پر ہی ختم ہوئی اس جنگ بندی میں ثالثی کا کردار امریکانے ادا کیا۔

جبکہ پاکستان نے کوئی الزام آج تک بھارت پر نہیں لگایا اور صرف امن کی طرف کوششیں کی کہ خطے میں امن ہی قائم رہے لیکن بھارت کو امن دیکھ کر سکون کہاں آتا ہے اسی وجہ سے بھارت اس قسم کی الزام تراشیاں کرتا رہتا ہے۔ بھارت کی جانب سے یکطرفہ اقدامات جیسے 5 اگست 2019 کو آرٹیکل 370 کا خاتمہ کرنا نہ صرف دوطرفہ معاہدوں کی خلاف ورزی تھی بلکہ اس سے خطے میں مزید کشیدگی بڑھی۔

پاکستان کی طرف سے مسئلہ کشمیر کو ہر بین الاقوامی فورم پر اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی مگر بھارت کی ہٹ دھرمی نے مذاکرات کے تمام دروازے بند کر رکھے ہیں۔ خیر پاکستان بھی بھارت کو سخت جواب دیتا ہے لیکن بھارت باز نہیں آتا اور اسکے علاوہ دونوں ممالک نے مزاکرات بھی کئی بار کئے لیکن مزاکرات کی کامیابی ہمیشہ مشکوک ہی رہیں۔ اب پاکستان اور بھارت تعلقات میں بہتری کے لئے دونوں ممالک کو اپنی ترقی و اقتصادی معاملات میں بہتری کے لئے آپس میں مل کر کام کرنا ہو گا اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں تو پورے جنوبی ایشیا میں اقتصادی ترقی اور استحکام ممکن ہو سکتا ہے۔ دونوں ممالک کی اقتصادی ترقی سے نہ صرف انکی معیشت کو فروغ ملے گا بلکہ غربت، بیروزگاری اور دیگر سماجی مسائل پر قابو پانے میں بھی مدد ملے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ پاکستان بھارت دونوں ممالک کو ایک دوسرے کے ساتھ اعتماد سازی کے لئے بھی عملی اقدامات کرنے ہونگے۔ اس میں سرحدی علاقوں میں جنگ بندی کے معاہدے انسانی حقوق کی پامالیوں پر قابو پانا شامل ہو سکتا ہے۔ جس سے دونوں ممالک کے درمیان تجارتی تعلقات کو بڑھا کر خطے کی معیشت کو فائدہ بھی پہنچایا جا سکتا ہے

سماجی اور ثقافتی تبادلوں کا فروغ دونوں ممالک کے عوام کے درمیان بہتر تعلقات قائم کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ دوسری جانب، کرتارپور راہداری جیسی مثبت پیش رفتیں اس بات کا ثبوت ہے کہ پاکستان امن کے ساتھ ساتھ اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ بھی کرتا ہے۔ اگر نیت درست ہو تو امن کی راہیں بھی نکالی جاسکتی ہیں۔

اب وقت کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں ممالک اپنی پرانی وروایتی دشمنی کو چھوڑ کر امن، ترقی اور تعاون کے راستے پر قدم بڑھائیں تاکہ دونوں ممالک کے عوام خوشحال اور محفوظ زندگی گزار سکیں۔ امن کوئی کمزوری نہیں ہے بلکہ دانشمندی اور دوراندیشی کی علامت بھی ہے جس سے ملک و قوم امن واستحکام میں رہتے ہیں۔

اسی مناسبت سے یہ شعر بھی ذہن میں آیا کہ:

دشمنی جم کر کرو لیکن یہ گنجائش رہے

جب کبھی ہم دوست ہو جائیں تو شرمندہ نہ ہوں

بشیر بدر

# آخر کشمیر ہی کیوں؟

نمرہ ظہور

کشمیر ایک خوبصورت وادی ہے جہاں قدرت نے اپنی ساری خوبصورتی جمع کر دی ہے۔ یہاں خزاں میں چنار کے درخت سرخ اور زرد ہو جاتے ہیں، اور بہار میں پھولوں کی خوشبو ہوا کو مہکا دیتی ہے۔ دریائے جہلم کی روانی دل کو سکون دیتی ہے۔ مغل باغات کی خوبصورتی، پشمینہ کی نرمی، اور کشمیری قالینوں کا خوبصورت کام، سب مل کر کشمیر کو زمین پر جنت بناتے ہی۔

کشمیر صرف ایک وادی نہیں، ایک جدوجہد کا نام ہے۔ یہاں ہر آنکھ میں آنسو، ہر دل میں درد اور ہر گھر میں قربانی کی کہانی چھپی ہے۔ عالمی طاقتیں اگرچہ جنگ بندی اور معاہدوں کی بات کرتی ہیں، مگر کشمیر کا ہر فرد روز ایک نئی جنگ جیتنے اور ہارنے کے عمل سے گزرتا ہے۔ جب تک مظلوم کی فریاد کو انصاف نہ ملے، تب تک کسی بھی معاہدے کا مطلب صرف کاغذی وعدہ ہی رہتا ہے۔ کشمیر بولتا ہے، تڑپتا ہے اور دنیا ابھی بھی خاموش ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب بھی پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی بڑھتی ہے، تو آخر کشمیر ہی کیوں اس تنازعے کا مرکز بنتا ہے کیوں ہر بار کشمیری عوام ہی قربانی کا بکرا بنتے ہیں کیوں ان کی زندگی، ان کے خواب، اور ان کا سکون ہمیشہ سیاست کی بھینٹ چڑھتا ہے

کشمیر کی خوبصورتی صرف اس کے مناظر میں نہیں، بلکہ اس کے لوگوں کی مہمان نوازی، ان کی ثقافت، اور ان کے جذبۂ محبت میں بھی ہے۔ یہ وادی صرف ایک جغرافیائی خطہ نہیں، بلکہ ایک زندہ دل قوم کا مسکن ہے، جو صدیوں سے امن، محبت، اور بھائی چارے کی مثال بنی ہوئی ہے۔ ہر بار جب پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی بڑھتی ہے، ایک سوال ذہن میں آتا ہے: آخر کشمیر ہی کیوں؟ کیوں ہر تنازعے کی جڑ یہی وادی بنتی ہے؟ کیوں ہر بار کشمیری عوام ہی قربانی کا بکرا بنتے ہیں؟

22 اپریل 2025 کو پہلگام میں ہونے والے دہشت گرد حملے میں 26 بے گناہ سیاحوں کی جانیں گئیں۔ بھارت نے اس حملے کا الزام پاکستان پر عائد کیا، جس کے بعد دونوں ممالک کے درمیان کشیدگی میں اضافہ ہوا۔

اس کے نتیجے میں، لائن آف کنٹرول کے دونوں جانب ہزاروں کشمیریوں کو اپنے گھروں سے بے دخل ہونا پڑا، اور درجنوں افراد جان سے گئے۔

یہ پہلا موقع نہیں ہے جب کشمیر کسی تنازعے کا مرکز بنا ہو۔ 1947 سے لے کر آج تک، کشمیر تین جنگوں، متعدد سرحدی جھڑپوں، اور بے شمار سیاسی تنازعات کا مرکز رہا ہے۔ ہر بار جب دونوں ممالک کے درمیان تعلقات میں تلخی آتی ہے، اس کا خمیازہ کشمیری عوام کو بھگتنا پڑتا ہے۔

بھارت کا مؤقف ہے کہ کشمیر اس کا اٹوٹ انگ ہے، جبکہ پاکستان اسے ایک متنازعہ علاقہ قرار دیتا ہے جس کا فیصلہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق ہونا چاہیے۔ یہ متضاد مؤقف ہی اس مسئلے کو پیچیدہ بناتا ہے۔

اقوام متحدہ نے بارہا دونوں ممالک سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ کشمیر کے مسئلے کو پرامن طریقے سے حل کریں۔ تاہم، ہر بار یہ مطالبہ نظرانداز کیا جاتا ہے، اور کشمیری عوام ایک بار پھر تنازعے کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کب تک؟ کب تک کشمیری عوام کو اپنی شناخت، آزادی، اور امن کے لیے قربانیاں دینی پڑیں گی؟ کب تک یہ وادی خون سے رنگین ہوتی رہے گی؟

اب وقت آگیا ہے کہ دونوں ممالک اپنے اختلافات کو پس پشت ڈال کر کشمیری عوام کی فلاح و بہبود کے لیے سنجیدہ اقدامات کریں۔ ایک ایسا حل تلاش کیا جائے جو نہ صرف دونوں ممالک کے لیے قابل قبول ہو، بلکہ کشمیری عوام کی خواہشات کا بھی احترام کرے۔

آخری بات

آخر کشمیر کیوں؟ کیونکہ کشمیر وہ درد ہے جو ہر پاکستانی کے دل میں دھڑکتا ہے، وہ زخم ہے جو ہر مسلمان کی غیرت کو جھنجھوڑتا ہے۔ یہ صرف زمین کا ٹکڑا نہیں، یہ ایک قوم کی شناخت، ان کی قربانیاں، اور ان کے بنیادی انسانی حقوق کا مسئلہ ہے۔

ہمیں چاہیے کہ ہم صرف نعرے نہ لگائیں، بلکہ کشمیر کی آواز کو دنیا تک پہنچائیں۔ اپنی دعاؤں، اپنے قلم، اپنی میڈیا، اور اپنی پالیسی کے ذریعے کشمیر کے سچے سفیر بنیں۔ ہر سطح پر کشمیریوں کی حمایت کو نہ صرف اخلاقی بلکہ عملی طور پر ثابت کریں۔

کیونکہ اگر آج ہم خاموش رہے تو کل تاریخ ہم سے سوال ضرور کرے گی

جب کشمیر جل رہا تھا تم کہاں تھے؟

# نظریاتی غلامی: ایک خاموش زنجیر

سعد کیانی

آزادی کا جشن منانے والی قوم اگر سوچنے کا حق کسی اور کے سپرد کرے تو دراصل وہ قید میں ہے- ایک خاموش نظریاتی قید میں۔۔۔

ہم میں سے اکثر لوگوں کا یہ ماننا ہے کہ غلامی صرف زنجیروں سے جکڑے جانے کا نام ہے لیکن دراصل غلامی وہ ہے جو زنجیروں سے نہیں خیالات سے جکڑی ہوتی ہے. یہ خاموش ہوتی ہے مگر اس کی گونج نسلوں تک سنائی دیتی ہے۔ کسی انسان یا چیز کے خیالات کو اپنے ذہن میں ایسے جکڑ لینا کہ اس کے علاوہ سب دھندلا دکھائی دے اصلی ذہنی غلامی ہے اور اس غلامی کی زنجیر کو نہ تو کوئی انقلاب نہ ہی جنگ اور نہ ہی کوئی نظریہ توڑ سکتا ہے۔ نظریاتی غلامی کوئی اچانک پیدا ہونے والا رجحان نہیں بلکہ ایک تدریجی عمل ہے جو کہ مختلف سیاسی تعلیمی معاشرتی اور نفسیاتی عوامل کے ذریعے ایک فرد یا قوم کے اندر رچ بس جاتا ہے۔

ہمارے معاشرے کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ہم وہی مان لیتے ہیں جو بتایا جاتا ہے ہم وہی سوچتے ہیں جو ہمیں ورثے میں ملا ہوتا ہے۔ نہ تو ہم تحقیق کرنے کی زحمت کرتے ہیں نہ ہی کسی مستند ذرائع سے اس بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب کوئی بندہ اس روایتی انداز سے ہٹ کر سوچنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ یا تو کافر کہلاتا ہے یا ملک دشمن۔۔ سوال کرنے کی روایت کو ہم نے بدتمیزی کا نام دے دیا ہے اور اختلاف کو نفرت کے مترادف بنا دیا ہے۔ ہم نے علم کو رٹا اور عقیدے کو ہتھیار بنا لیا ہے۔۔

نظریاتی غلامی کی سب سے خطرناک شکل وہ ہے جو تعلیمی اداروں میں پروان چڑھتی ہے جب ایک بچے سے کہا جاتا ہے کہ جو لکھا ہے وہی صحیح ہے وہاں سے ہی اس کے دماغ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور وہ سوال کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ جب استاد بحث کو جرم اور رٹے کو انعام سمجھے تو وہ قومیں علم کی راہ چھوڑ کر عقیدے کی دلدل میں پھنس جاتی ہیں۔

جب ایک فرد یا قوم مالی طور پر بھی کسی پر انحصار کرنا شروع کر دیتے ہیں تو نظریاتی آزادی بھی متاثر ہوتی ہے موجودہ دور میں میڈیا بھی اس میں اہم کردار ادا کر رہا ہے اور سیاست دان اس کو اہم ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔

ہم نے ہمیشہ شخصیات کو نظریات پر فوقیت دی ہے ہم نے لیڈروں کو خدا بنالیا ہے اور ان کے ہر غلط عمل اور فیصلے کو حق کا لبادہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔ اپنی شناخت سوچ اور آواز کو دوسروں کے نظریے میں دفن کر دیا ہے اور خوشی خوشی دفن کیا ہے۔ ہم نے سوچنے کے بجائے ماننے کو فخر کا درجہ دیا ہے۔ لیڈروں کی من گھڑت کہانیاں اور تقریریں سن سن کر جھوٹ کو بھی سچ سمجھ لینا ہمارے معاشرے کا المیہ ہے۔ اس وجہ سے دشمنیاں عروج پر ہیں حتی کہ بھائی بھائی کا دشمن بنا بیٹھا ہے

اب سوال یہ ہے کہ اس غلامی سے کیسے نکلا جائے ؟؟ علاج صرف ایک ہے۔۔ خود احتسابی

جب انسان خود سے سوال کرتا ہے اور اپنا احتساب کرتا ہے کہ وہ جو مان رہا ہے وہ سچ ہے یا صرف وراثت ؟ تو وہ نظریاتی غلامی کے دروازے پر پہلی ضرب لگاتا ہے جب نوجوان یا طالب علم یہ ہمت کرتا ہے کہ وہ کتاب کو اخری سچ نہ سمجھے بلکہ پہلا سوال سمجھیں تب معاشرے ازاد ہونے لگتے ہیں ہر بات کو مان لینے سے پہلے خود سے سوال کریں کہ کیا واقعی یہ بات درست ہے اور اس کا دوسرا پہلو کیا ہو سکتا ہے مختلف نظریات مکاتب فکر اور تاریخ کا مطالعہ کریں تاکہ ذہن کھلیں اور مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو اپنے عقل فہم اور تجربے پر بھروسہ رکھیں دوسروں کی رائے اہم ہو سکتی ہے لیکن حرف آخر نہیں۔۔ کھلے دل سے دوسروں کی بات سنیں لیکن اپنی رائے قائم کرنے کا حق محفوظ رکھیں اور دوسروں کی تقلید کے بجائے اپنی رائے کو اہمیت دیں۔

# جذبہ تو ہے، لیکن میدان نہیں!

سید کمیل حیدر

پاکستان میں فٹبال کو اگر دلوں کا کھیل کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ ملک بھر میں لاکھوں نوجوان اس کھیل سے محبت کرتے ہیں، یورپین فٹبال لیگز کے باقاعدہ فالوور ہیں، اپنے پسندیدہ کلبوں اور کھلاڑیوں سے جذباتی وابستگی رکھتے ہیں۔ چاہے وہ مانچسٹر یونائیٹڈ ہو یا بارسلونا، ریال میڈرڈ ہو یا لیورپول، پاکستانی شائقین ان ٹیموں کے میچز رات گئے تک دیکھتے ہیں، ان کے جھنڈے اور جرسیز خریدتے ہیں، اور ان کے نتائج پر جذباتی ردِ عمل دیتے ہیں۔ یہ وہی ملک ہے جہاں نوجوان فٹبالرز اپنے آئیڈیل کھلاڑیوں کو نہ صرف پسند کرتے ہیں بلکہ انہیں اپنا ہیرو مانتے ہیں۔ ان کی تصویریں دیواروں پر آویزاں ہوتی ہیں، موبائل اسکرینز پر وال پیپر کی صورت سجی ہوتی ہیں، اور ان کے کھیلنے کا انداز اپنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس شوق اور جذبے کو دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب فٹبال کے چاہنے والے اتنی بڑی تعداد میں موجود ہیں تو پھر پاکستان میں یہ کھیل پروفیشنل سطح پر کیوں ترقی نہیں کر پایا؟

اس سوال کا ایک پہلو قومی کھیلوں کی ترجیحات سے بھی جُڑا ہے۔ کرکٹ کے جنون نے تو ہمیں ہاکی جیسے قومی کھیل سے بھی آہستہ آہستہ دور کر دیا ہے۔ وہ پاکستان، جو کبھی دنیائے ہاکی میں اپنی شناخت رکھتا تھا، آج وہاں دکھائی بھی نہیں دیتا۔ یہی روش دیگر کھیلوں کو بھی متاثر کر رہی ہے، اور فٹبال اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔ کھیل کے میدان میں جو مقام دیگر ممالک نے فٹبال کے ذریعے حاصل کیا، ہم وہاں تک نہ پہنچ سکے۔ بھارت، بنگلہ دیش، اور یہاں تک کہ افغانستان جیسے ممالک میں فٹبال لیگز کا قیام ہو چکا ہے، جو نوجوانوں کو نہ صرف مواقع فراہم کر رہے ہیں بلکہ ملکی سطح پر ایک نئی اسپورٹس انڈسٹری کو بھی جنم دے رہے ہیں۔

پاکستان میں اگرچہ فٹبال فیڈریشن تو موجود ہے، ایک ٹائم پر پاکستان پریمیئر لیگ بھی کھیلی جاتی تھی لیکن اسے وہ حیثیت و شناخت نہ دی گئی جو ملنا چاہیے تھی۔ پاکستان میں ٹیم بھی موجود ہے جو وقتاً فوقتاً میدان میں بھی اترتی ہے، مگر ایک مستحکم، جاری رہنے والی پروفیشنل لیگ کی کمی شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔ یہاں یہ بات واضح طور پر کہنا ضروری ہے کہ ایسا نہیں کہ پاکستان میں ٹیلنٹ موجود نہیں۔ ٹیلنٹ تو ہماری قوم میں کوٹ کوٹ

کہ بھرا ہے اور اس کھیل میں بھی ہزاروں نوجوان اپنی صلاحیتوں کو دکھانے کے لیے پلیٹ فارم کی تلاش میں ہیں۔ فٹبال سے جڑے خواب آنکھوں میں سجائے ہزاروں باصلاحیت لڑکے و لڑکیاں اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہمارے پاس صلاحیت کی کوئی کمی نہیں۔ البتہ جب ان کے سامنے مناسب مواقع نہیں ہوتے تو ان میں سے کئی باصلاحیت کھلاڑی بیرونِ ملک چلے جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں تاکہ اپنی فٹبالنگ صلاحیتوں کو منوایا جا سکے۔ اگر ایک منظم پروفیشنل لیگ کا آغاز ہو، تو نہ صرف یہ مقامی ٹیلنٹ ملکی سطح پر ابھرے گا، بلکہ ممکن ہے کہ بیرونِ ملک سے کھلاڑی بھی یہاں آ کر کھیلیں، جس سے نہ صرف مسابقت بڑھے گی بلکہ عالمی معیار کی تربیت اور تجربہ بھی مقامی کھلاڑیوں کو حاصل ہو گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ پاکستان سوپر لیگ کی طرح پاکستان پریمیئر لیگ کے میچز میں بھی شائقین فٹبال سٹیڈیم کو ایسے بھر دیں گے جیسے اس کھیل کی محبت ان کے دلوں میں بھری ہوئی ہے۔

یقیناً، فٹبال پاکستان میں صرف ایک کھیل نہیں بلکہ ایک موقع ہے، نوجوانوں کو مثبت سرگرمیوں کی طرف راغب کرنے کا، ملک کی نمائندگی کرنے کا، اور ایک نیا فخر پیدا کرنے کا۔ جس طرح پاکستانی شائقین دنیا کے بہترین کھلاڑیوں کو سراہتے ہیں، ویسے ہی اگر انہیں اپنے ملک کے فٹبالرز پر فخر کرنے کا موقع دیا جائے تو وہ دن دور نہیں جب پاکستان بھی دنیائے فٹبال میں اپنی شناخت بنا سکے گا۔

# لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

**تربیہ صفدر**

لکھیں گے کیونکہ لکھیں گے نہیں تو نکارہ خدا کیسے بنیں گے ارے صاحب یہ ہم اپنے بارے میں نہیں کہہ رہے کہ لکھیں گے ہم تو لکھتے ہی رہتے ہیں- ہم تو اپنی پاکستانی قوم زندہ دل پاکستانیوں کی بات کر رہے ہیں- جو اتفاق و اتحاد کی عمدہ مثال ہیں-ایک موضوع کو چن لیں تو پھر چن چن کر مارتے نہیں لکھ لکھ کر مارتے ہیں-جی ہاں چن چن کر الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں اور دشمنوں کے دلوں کو ہلا دیتے ہیں

ابھی دیکھیے بھارت نے ہمیں دھمکیاں دی سرجیکل سٹرائکس کی ہماری بہادر فوج نے انہیں منہ توڑ جواب دیا لیکن جتنا کھڑا جواب ہماری ویلی عوام نے دیا اس کا تو جواب نہیں میمز کا طوفان آگیا جگتوں کا بازار گرم ہو گیا بھارت کی فوج تو کیا ان کی عوام بھی جھلت گئے کہ یہ کس قوم سے پالا پڑ گیا حالانکہ پالا تو ہمیشہ ان کا ہم سے ہی پڑا تھا لیکن یہ پالا ہماری جنزی سے پڑا ہے اور جنزی کا سب سے بڑا ہتھیار سیل فون ہے - پھر اس میں دوڑتی انٹرنیٹ کی سائنس اور ہمارے بلاگرز، ولاگرز اور سب سے بڑھ کر میمز- صدقے جاؤں - جنگ کا نام سنتے ہی اقوام کانپ جاتی ہے - جان جانے کا خوف، پیاروں سے بچھڑنے کا ڈر، زیست کی ارزاتی کا خطرہ، گھر سے بے گھر ہونے کا خوف ،زندگی لرزتی ہے سانس کپکپاتی ہے جنگ ایک ہولناک نقشہ کھینچتی ہے لیکن جب میمز کے محلے میں گئے تو ایک لکھتا ہے کہ جنگ کے بعد کرینہ صرف میری ہے اسے بھابھی سمجھنا- ہم تو اس اعتماد کے دیوانے ہو گئے مگر یہ کیا ایک اور کا فرمان دیکھیے سارا شہر بانٹ لینا مگر امبانی کا گھر میں نے پسند کیا ہے وہ میرا ہی ہو گا یعنی کمال ہو گیا-

اس پر ہی بس نہیں جمعرات کو ان کے وزیر اعظم چائے والے مودی نے بڑھک لگائی کہ کل دیکھنا کیا ہو گا تو جواب ایا کہ لوگ جمعے ولیمہ نہیں رکھتے تم نے جنگ رکھ دی پاگل -ایک اور فریاد بھی بہت دردناک تھی تین چار نوجوان بیٹھے رو رہے تھے کسی نے پوچھا کیا ہوا تو بولے کہ جب ہم لڑکپن میں تھے کرونا اگیا اب ہم جوانی کو پہنچے تو جنگ اگئی ہم شادی کیسے کریں گے -مودی جواب دو- ظلم کا حساب دو- لیکن اسی افراتفری میں کچھ نوجوان نے تو

اپنے رشتوں کا بھی اعلان کر دیا ہے - کوئی نوجوان بتاتا ہے کہ عالیہ بھٹ سے بات پکی سمجھو تو وہیں ایک بوڑھے چاچا نے ایشوریہ رائے کو اپنی چاچی بنانے کا بھی اعلان کیا ہے -

پراپرٹی ڈیلرز کی بھی خوب کہانی ہے انہوں نے ممبئ میں ڈی ایچ اے بنانے کا اعلان کیا ہے - ایک صاحب نے تو تاج محل پر چائے کا ڈھابہ کھولنے کا اعلان کیا ویسے بزنس تو اچھا ہے کچھ یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات کہہ رہے ہیں کہ اگلا سیمسٹر دلی والے کیمپس میں رکھیں گے -

خواتین بھی پیچھے کیوں رہیں - انہیں تو جنگ کی مناسبت سے کپڑوں کی تیاری کی فکر ہے اور ایک دوسرے سے پوچھ رہی ہیں کہ کس رنگ کے کپڑے اور میچنگ جولری کیسی ہو - ایک جولری برینڈ نے تو بندوقوں والے ایر نگز اور گولیوں کا لاکٹ بھی انٹروڈیوس کروا دیا ہے - سنا ہے کہ ملکوں نے اگلا گانا نکدا کو کا بڑا انو کھا لب لب تھکیاں نہیں لبدا - من جا مودی ممبئ بنا دل نہیں لگدا بنانے کا اعلان کیا ہے اور ساتھ میں کٹرینہ کیف سے کانٹریکٹ بھی سائن کروالیا ہے - البتہ ایک دو باتیں پریشان کن بھی ہیں اور وہ یہ ہے کہ انڈین اداکاروں کی بری نظر فواد خان، ماہرہ خان، ہانیہ عامر پر ہے -

بزنس مین طبقہ بھی پیچھے نہیں رہا انہوں نے ٹاٹا کمپنی کا رشتہ باٹا کمپنی سے طے کر دیا ہے اور اعلان کیا ہے کہ عنقریب ٹاٹا بنا کر باٹا کے گھر اجائے گا - مبارک ہو سب کو اب چاہے مودی کو سوچنا چاہیے کہ وہ ہمیں ڈرانے چلا تھا -

اے دشمن دین تو نے کس قوم کو للکارا

لے ہم بھی ہیں صفت ارا - لے ہم بھی ہیں صفت ارا -

ارے بھیا تمہاری دھمکیوں سے تو ہمارے بچے نہیں ڈرتے فوج کیا ڈرے گی - بہتر ہے کہ اچھے بچوں کی طرح بے عزتی سنبھال لو اور گھر جاؤ — شاباش

# سائبر سیکیورٹی

فاطمہ مصطفیٰ

سائبر سیکیورٹی آج کے ڈیجیٹل دور میں ایک خطرناک اور اہم چیلنج بن چکا ہے۔ جیسے جیسے دنیا کے ڈیجیٹائز ہونے کی رفتار بڑھ رہی ہے، ویسے ہی انٹرنیٹ پر موجود خطرات میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ پاکستان میں بھی یہ مسئلہ شدت اختیار کر رہا ہے، جہاں نہ صرف ذاتی صارفین بلکہ ادارے اور حکومتیں بھی سائبر حملوں کا نشانہ بنی ہیں۔ سائبر سیکیورٹی کا مقصد ڈیجیٹل انفراسٹرکچر کی حفاظت کرنا، ذاتی اور حساس معلومات کی حفاظت کو یقینی بنانا ہے-اور آن لائن حملوں سے تحفظ کے لیے مؤثر حکمت عملی اپنانا ضروری ہے۔ پاکستان میں سائبر سیکیورٹی سے متعلق متعدد ادارے سرگرم ہیں، جن میں پاکستان کمپیوٹر ایمرجنسی ریسپانس ٹیم (PKCERT) اور نیشنل سائبر کرائم انویسٹیگیشن ایجنسی (NCCIA) شامل ہیں۔ یہ ادارے سائبر حملوں کا سراغ لگانے، ان سے نمٹنے اور متاثرین کی مدد کرنے کے لیے متحرک ہیں۔ البتہ، ان اداروں کی قابلیتیں محدود ہیں اور انہیں اضافی وسائل اور تربیت کی ضرورت ہے۔ پاکستان میں سائبر سیکیورٹی کی آگاہی کی کمی بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ زیادہ تر افراد اور ادارے سائبر خطرات سے بے خبر ہیں اور ان کے تحفظ کے لیے ضروری اقدامات نہیں کرتے۔ اس کمی کو حل کرنے کے لیے حکومت، تعلیمی ادارے اور نجی شعبہ مشترکہ طور پر آگاہی مہمات اور تربیتی پروگرام شروع کر سکتے ہیں۔ سائبر سیکیورٹی کے لیے ایک منظم حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ جو صرف ٹیکنالوجی پر توجہ نہیں دیتا بلکہ انسانی پہلو کو بھی مد نظر رکھتا ہے۔ اس حکمت عملی میں قانون سازی، اداروں کی مضبوطی، ٹیکنالوجی کی ترقی اور عوامی آگاہی شامل ہونی چاہیے۔ پاکستان میں سائبر سیکیورٹی کے موضوع پر کچھ اہم اقدامات اٹھائے گئے ہیں، جن میں الیکٹرانک جرائم ایکٹ 2016 کی تشکیل اور نیشنل سائبر سیکیورٹی پالیسی 2021 کا مسودہ شامل ہے۔ البتہ، ان اقدامات کی مؤثر عمل درآمد اور نگرانی کی ضرورت ہے تاکہ سائبر حملوں سے تحفظ ممکن بن سکے۔ سائبر حملوں کے بڑھتے ہوئے خطرات کے پیش نظر، پاکستان کو اپنی سائبر دفاعی صلاحیتوں کو مزید مستحکم کرنے کی

ضرورت ہے۔ اس کے لیے جدید ٹیکنالوجیوں کا استعمال، ماہر افراد کی تربیت اور بین الاقوامی تعاون بہت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ، عوامی سطح پر سائبر سیکیورٹی کی آگاہی بڑھانے کے لیے تعلیمی اداروں، میڈیا اور سوشل میڈیا کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ آخر میں، یہ کہنا اہم ہے کہ سائبر سیکیورٹی صرف حکومت یا اداروں کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ یہ ہر فرد کی ذمہ داری ہے۔ اگر ہم سب مل کر سائبر خطرات کی معلومات حاصل کریں اور ان سے بچنے کے لیے ضروری احتیاطی تدابیر اختیار کریں، تاکہ ہم ایک محفوظ ڈیجیٹل فضا تشکیل دے سکیں۔

سائبر سیکیورٹی ایک ایسا موضوع ہے جو آج کے ڈیجیٹل دور میں انتہائی اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ جیسے جیسے دنیا ٹیکنالوجی کی جانب بڑھ رہی ہے، ویسے ویسے انٹرنیٹ اور کمپیوٹر سسٹمز کے ذریعے ہونے والے حملوں اور خطرات میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک میں جہاں ڈیجیٹل انفراسٹرکچر تیزی سے ترقی کر رہا ہے، وہاں سائبر سیکیورٹی کے مسائل بھی سنگین ہوتے جا رہے ہیں۔ سائبر سیکیورٹی کا مقصد کمپیوٹر سسٹمز، نیٹ ورکس، اور ڈیٹا کو غیر مجاز رسائی، نقصان، یا چوری سے محفوظ رکھنا ہے۔ یہ نہ صرف افراد کی ذاتی معلومات کی حفاظت کرتا ہے بلکہ قومی سلامتی کے لیے بھی ضروری ہے۔ پاکستان میں سائبر کرائمز میں اضافہ ہو رہا ہے، جس میں فشنگ، ہیکنگ، اور ڈیٹا چوری جیسے واقعات شامل ہیں۔ ان حملوں سے نہ صرف مالی نقصان ہوتا ہے بلکہ عوام کا اعتماد بھی مجروح ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ، سوشل انجینئرنگ حملے جیسے فشنگ اور وِشنگ بھی عام ہو چکے ہیں، جن میں افراد کی ذاتی معلومات حاصل کر کے انہیں نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ ان حملوں کا مقصد افراد کو دھوکہ دے کر ان کی ذاتی معلومات حاصل کرنا ہوتا ہے، جس سے مالی نقصان اور دیگر مسائل جنم لیتے ہیں۔ پاکستان میں سائبر سیکیورٹی کے حوالے سے مختلف ادارے کام کر رہے ہیں، جن میں نیشنل سینٹر فار سائبر سیکیورٹی (NCCS) اور نیشنل سائبر کرائمز انویسٹیگیشن ایجنسی (NCCIA) شامل ہیں۔ NCCS کا مقصد تعلیمی اداروں میں سائبر سیکیورٹی کی تعلیم اور تحقیق کو فروغ دینا ہے، جبکہ NCCIA کا مقصد سائبر کرائمز کی تحقیقات اور ان سے نمٹنا ہے۔ ان اداروں کی موجودگی سے سائبر سیکیورٹی کے حوالے سے آگاہی اور اقدامات میں بہتری آ رہی ہے۔

سائبر سیکیورٹی کے حوالے سے عوامی آگاہی بھی ضروری ہے۔ افراد کو اپنے کمپیوٹر اور موبائل ڈیوائسز کی سیکیورٹی کے بارے میں آگاہی حاصل کرنی چاہیے۔ مضبوط پاس ورڈز کا استعمال، اینٹی وائرس سافٹ ویئر کی تنصیب، اور مشکوک ای میلز یا لنکس پر کلک کرنے سے گریز کرنا جیسے اقدامات سے سائبر حملوں سے بچا جا سکتا ہے۔ حکومت کو بھی سائبر سیکیورٹی کے حوالے سے پالیسیز اور قوانین بنانے کی ضرورت ہے تا کہ سائبر کرائمز کو روکا جا سکے اور متاثرہ افراد کو انصاف مل سکے۔ اس کے علاوہ، بین الاقوامی سطح پر بھی سائبر سیکیورٹی کے حوالے سے تعاون کی ضرورت ہے تا کہ مشترکہ خطرات کا مقابلہ کیا جا سکے۔ سائبر سیکیورٹی صرف حکومت یا اداروں کا مسئلہ نہیں بلکہ ہر فرد کی ذمہ داری ہے۔ جب تک افراد اپنی ذاتی سیکیورٹی کے بارے میں آگاہ نہیں ہوں گے، تب تک سائبر حملوں کا مقابلہ کرنا مشکل ہو گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہر فرد سائبر سیکیورٹی کے بارے میں آگاہ ہو اور اس پر عمل کرے۔ آخر کار، سائبر سیکیورٹی ایک مسلسل عمل ہے جو وقت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ جیسے جیسے ٹیکنالوجی ترقی کرتی ہے، ویسے ویسے سائبر حملوں کے طریقے بھی بدلتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے سسٹمز اور معلومات کی حفاظت کے لیے مستقل اقدامات کریں اور سائبر سیکیورٹی کے حوالے سے آگاہی حاصل کریں۔ اس کے ذریعے ہم نہ صرف اپنی ذاتی معلومات کی حفاظت کر سکتے ہیں بلکہ اپنے ملک کی سائبر سیکیورٹی کو بھی مضبوط بنا سکتے ہیں۔

## وادی داریل: وہ جنت جو ابھی دریافت ہونا باقی ہے۔

### فضل حکیم

جب بھی پاکستان کے شمالی علاقوں کی بات ہوتی ہیں، تو لوگوں کے ذہن میں فوری ناران کاغان، ہنزہ، گلگت، یا اسکردو جیسے مشہور مقامات آتے ہیں۔ لیکن ان مشہور مقامات کے پیچھے چھپے کچھ ایسے علاقے بھی ہیں جو اپنی تمام تر خوبصورتی کے باوجود سیاحوں کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ انہی میں سے ایک وادی داریل ہے۔

وادی داریل، گلگت بلتستان کے ضلع دیامر میں واقع ہے۔ یہ وادی نہ صرف قدرتی حسن سے مالامال ہے بلکہ اپنی تہذیب، ثقافت اور مہمان نوازی کے باعث بھی ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ بلند و بالا برف پوش پہاڑ، سرسبز چراگاہیں، ندی نالے، اور گھنے قدیم جنگلات اس وادی کو کسی خواب جیسا منظر پیش کرتے ہیں۔

داریل کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہاں کی خوبصورتی مصنوعی ترقی سے دور ہے، بلکہ ایک قدرتی اور سادہ طرزِ زندگی اب تک قائم ہے۔ یہاں کے لوگ سادہ، پرخلوص اور روایتوں کے امین ہیں۔ آپ کسی بھی گھر جائیں، چائے اور کھانے کی دعوت سے آپ کا استقبال ہوگی۔

وادی صرف ایک سیاحتی مقام نہیں، بلکہ ایک زندہ ثقافت کا نمائندہ ہے۔ یہاں کی زبان، روایتی لباس، مقامی موسیقی اور لوک کہانیاں آج بھی زندہ ہیں۔ مگر افسوس کہ حکومتی اور نجی اداروں کی عدم توجہی کی وجہ سے یہ علاقہ اب بھی ترقی کی راہوں سے دور ہے۔

اگر حکومت اور سیاحت کے متعلقہ ادارے اس وادی پر توجہ دیں، بنیادی سہولیات فراہم کریں اور سیاحت کو فروغ دیں، تو داریل نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی ایک نمایاں مقام حاصل کر سکتا ہے۔

تاہم، اس ساری خوبصورتی اور ثقافت کے باوجود وادی داریل بدقسمتی سے حکومتی اور نجی اداروں کی توجہ سے محروم ہے۔ سڑکوں کی حالت، صحت و تعلیم کی سہولیات، اور سیاحت کے بنیادی ڈھانچے کی کمی داریل جیسے

خوبصورت مقام کو دنیا سے چھپا کر رکھے ہوئے ہے۔ سیاحت کے فروغ کے لیے بنیادی انفراسٹرکچر کا ہونا ضروری ہے،

## دیر آید درست آید۔!

کسی علاقے کو ضلع کا درجہ مل جانا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ ناقدین کچھ بھی کہیں اب داریل تانگیر کو ضلع کا درجہ مل چکا ہے۔ "ضلع جوان ہونے میں پانچ دس سال لگ جائیں گے۔ اضلاع کا انفراسٹرکچر بھی راتوں رات نہیں بنا تا۔ ہر شے وقت مانگتی ہے۔ وسائل کی تقسیم دو فارمولوں کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ بلحاظ ضلع اور بلحاظ آبادی۔ ضلع کے نام پر 40٪ اور آبادی کے نام پر 60٪ وسائل تقسیم ہوتے ہیں۔ دیامر گنجان آباد ضلع تھا، آج یہ تین حصوں میں بٹ گیا۔ عوام اور حکومتی اداروں کے سروں سے بوجھ اُتر گیا۔ وزیر اعلی گلگت بلتستان جناب گلبر خان صاحب نے داریل تانگیر اضلاع کا باضابطہ افتتاح کر کے لوگوں کے دیرینہ خواب کو شرمندہ تعبیر کیا۔

حاجی گلبر خان صاحب کا جس طرح سے داریل میں والہانہ استقبال ہوا اور جو عزت افزائی ہوئی وہ سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔(۔ اپنے مختصر دور اقتدار کے دور کافی کام کیے ہوں گے، میری نظر میں ان کے دو کارنامے انھیں تاریخ میں یاداشت کرنے کے لئے کافی ہیں۔

جے یو آئی کا دور اقتدار داریل کے لیے اس بار بہترین رہا ہے۔ اس پانچ سالہ دور میں ریکارڈ ترقیاتی کام ہوئے ہیں اور اس بات کی گواہی خود وزیر اعلی صاحب نے عوامی جلسے کے دوران دی ہے۔ اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہو گا کہ ضلع حاجی رحمت خالق کے دور اقتدار میں بن گیا ہے اور افتتاحی تختی پر حاجی صاحب کا نام جگمگا رہا ہے۔

سرکاری ملازمتوں کی تحصیل ورانہ تقسیم سے اب ہم آزاد ہیں۔ میری وادی کا کوئی بچہ / بچی اب ناخواندہ نہیں ہے۔ ہسپتالوں، اسکولوں اور کالجوں کی بہتات ہے۔ جن دفاتر کے چکر کاٹتے کاٹتے صبح سے شام، شام سے رات اور پھر شب سے سحر ہوتی تھی، چل چل کر جوتی گھس جاتی تھی، پاؤں میں آبلے پڑتے تھے، کمر کمان بن جاتی تھی مگر مقصد پھر بھی حاصل نہیں ہوتا تھا۔ اور تھکا ہارا لوٹ آتا تھا۔ اب وہ تمام دفاتر میرے گھر کی دہلیز پر موجود ہیں۔ میں کسی بھی وقت کسی بھی دفتر کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہوں۔ زیاں وقت اور زیاں زر کی اُلجھن باقی نہیں رہی۔

# فیشن کے زریعے ثقافتوں کا جوڑ: پاکستانی اور مغربی فیشن کا جائزہ

حفصہ احمد

فیشن کا نام سنتے ہی اکثر لوگوں کے ذہن میں ماڈلز، اور مہنگے کپڑے آتے ہیں، لیکن حقیقت میں فیشن صرف کپڑوں تک محدود نہیں ہوتا۔ یہ ایک اندازِ زندگی ہے۔ یہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہم کون ہیں، کس ماحول سے تعلق رکھتے ہیں - دنیا کے ہر کونے میں فیشن کا اپنا رنگ اور انداز ہوتا ہے۔ اگر ہم پاکستان اور مغرب کے فیشن کا موازنہ کریں تو ہمیں بہت سی چیزیں مختلف نظر آتی ہیں، لیکن کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو حیرت انگیز طور پر ایک جیسی ہیں۔

پاکستان میں فیشن عام طور پر روایت، تہذیب، اور خاندان سے جُڑا ہوا ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگ اپنے لباس کے ذریعے اپنی شناخت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ہم اکثر ایسے لباس پسند کرتے ہیں جو موقع کے حساب سے موزوں ہوں جیسے مذہبی تہوار، شادی بیاہ، یا روزمرہ زندگی۔ پاکستانی فیشن میں ایک خاص بات یہ ہے کہ یہاں لوگ اپنے معاشرے کی اقدار کو مدنظر رکھ کر لباس کا انتخاب کرتے ہیں۔ چاہے آپ کسی چھوٹے شہر میں رہتے ہوں یا بڑے، لوگ ایسے انداز اپناتے ہیں جو ان کی ثقافت سے میل کھاتے ہوں۔ فیشن یہاں صرف دکھاوا نہیں، بلکہ ایک طرح کی عزت اور وقار کی علامت بھی ہے۔

اب اگر ہم مغربی فیشن کی بات کریں تو وہ قدرے مختلف ہے۔ وہاں فیشن زیادہ تر ذاتی پسند اور آزادی کے احساس سے جڑا ہوا ہے۔ مغرب میں لوگ فیشن کو ایک ذریعہ سمجھتے ہیں اپنے خیالات، مزاج اور انفرادیت کو ظاہر کرنے کا۔ وہاں لباس کا مطلب صرف یہ نہیں ہوتا کہ آپ کیا پہنے ہوئے ہیں، بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ کیسے جینا چاہتے ہیں۔ چاہے کوئی بہت سادہ لباس پہنے یا کچھ منفرد، وہاں اسے ایک شخصی انتخاب سمجھا جاتا ہے، اور اس کا احترام کیا جاتا ہے۔

پاکستانی اور مغربی فیشن میں سب سے بڑا فرق سوچ کا ہے۔ پاکستان میں فیشن اکثر خاندان، مذہب، اور سماجی روایات سے جُڑا ہوتا ہے، جبکہ مغرب میں یہ زیادہ تر شخصی آزادی اور خود اظہاری کا ذریعہ ہے۔ پاکستان میں لوگ

عام طور پر یہ دیکھ کر لباس کا انتخاب کرتے ہیں کہ لوگ کیا کہیں گے، جبکہ مغرب میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ خود کو کیا اچھا لگتا ہے۔ اس فرق کی وجہ معاشرتی اقدار، پرورش، اور تعلیمی نظام بھی ہو سکتا ہے۔

وقت کے ساتھ دونوں دنیاؤں کے درمیان فاصلے کم ہو رہے ہیں۔ آج کے دور میں، خاص طور پر نوجوان نسل، فیشن کے معاملے میں زیادہ آزاد ہو چکی ہے۔ پاکستان میں بھی اب ایسے لوگ سامنے آ رہے ہیں جو اپنے انداز سے جینے کو ترجیح دیتے ہیں۔ سوشل میڈیا، انٹرنیٹ، اور بین الاقوامی رابطوں کی وجہ سے ہم دنیا بھر کے فیشن سے متاثر ہو رہے ہیں۔ اسی طرح مغرب میں بھی اب ایسے فیشن اسٹائل مقبول ہو رہے ہیں جو زیادہ باوقار اور سادہ ہوں۔ "موڈیسٹ فیشن" یعنی سادہ اور باحیا لباس کا تصور وہاں بھی اب قابلِ قبول ہو رہا ہے، جو ہمارے معاشرتی انداز سے بہت قریب ہے۔

فیشن ہمیں ایک اہم سبق دیتا ہے—اختلاف کے باوجود، ہم سب جُڑے ہوئے ہیں۔ چاہے ہم کسی بھی ملک، مذہب، یا ثقافت سے تعلق رکھتے ہوں، ہم سب اپنے انداز میں خوبصورتی تلاش کرتے ہیں۔ فیشن کے ذریعے ہم اپنی کہانی دنیا کو سناتے ہیں، اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں، اور اپنی پہچان بناتے ہیں۔

پاکستانی اور مغربی فیشن بظاہر مختلف ہیں، لیکن دونوں کا مقصد ایک ہی ہے: خود کو ظاہر کرنا، خوبصورتی کو محسوس کرنا، اور زندگی کو اپنے طریقے سے جینا۔ فرق صرف انداز کا ہے، نیت کا نہیں۔ ایک طرف اگر ہم روایت کو سنبھال کر آگے بڑھتے ہیں، تو دوسری طرف دنیا ہمیں یہ سکھا رہی ہے کہ خود کو آزادانہ اظہار دینا بھی ضروری ہے۔ ہمیں صرف یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ فیشن صرف فالو کرنے کی چیز نہیں، بلکہ سمجھنے اور اپنانے کی چیز ہے۔ جو ہمیں اچھا لگے، جو ہمارے دل کے قریب ہو—بس وہی اصل فیشن ہے۔

# پاکستان میں نوجوان نسل اور سگریٹ نوشی

جاریہ زہرہ

حالیہ برسوں میں پاکستان میں نوجوانوں میں سگریٹ نوشی کے رجحان میں خطرناک حد تک اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ جو عمل کبھی بڑی عمر کے افراد کا شوق سمجھا جاتا تھا، وہ اب نوجوانوں اور حتیٰ کہ کم عمر طلبہ و طالبات میں بھی تیزی سے عام ہوتا جا رہا ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے کیمپس سے لے کر چائے کے ہوٹلوں، انسٹاگرام اسٹوریز، اور رات گئے کی محفلوں تک، سگریٹ نوشی (چاہے وہ سگریٹ ہو، شیشہ ہو، یا ویپ) نوجوانوں کی زندگی کا ایک حصہ بن چکی ہے۔ یہ صرف صحت کا مسئلہ نہیں بلکہ ایک سماجی چیلنج بھی ہے، جو ہمارے معاشرے میں موجود گہرے نفسیاتی، ثقافتی اور قانونی خلا کی نشاندہی کرتا ہے۔

پاکستان ہیلتھ ریسرچ کونسل کے مطابق ملک میں تقریباً 2 کروڑ 20 لاکھ افراد تمباکو کسی نہ کسی شکل میں استعمال کرتے ہیں، اور ان میں بڑی تعداد 15 سے 29 سال کے نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ گلوبل یوتھ ٹوبیکو سروے (GYTS) کے مطابق سکول جانے والے بچوں میں بھی سگریٹ نوشی کے رجحان میں اضافہ ہو رہا ہے، اور اگرچہ لڑکوں کی تعداد زیادہ ہے، لیکن لڑکیوں میں بھی یہ رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

یہ اضافہ صرف روایتی سگریٹ نوشی تک محدود نہیں۔ بڑے شہروں میں شیشہ کیفے عام ہو چکے ہیں، جہاں فلیورڈ تمباکو ایک ایسے انداز میں پیش کیا جاتا ہے کہ وہ نوجوانوں کے لیے کم نقصان دہ محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح ویپنگ اور ای سگریٹس کو "محفوظ متبادل" کے طور پر مارکیٹ کیا جا رہا ہے، لیکن حقیقت میں ان میں بھی نکوٹین اور دیگر مضر صحت کیمیکل موجود ہوتے ہیں۔

نوجوانوں میں سگریٹ نوشی کی کئی وجوہات ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ رجحان اکثر ایک فیشن، سٹیٹس یا 'کول' بننے کے طریقے کے طور پر اپنایا جاتا ہے۔ نوجوان جب خود کو بڑے ہوتے ہوئے محسوس کرتے ہیں تو وہ ایسی عادتیں اپنانے کی کوشش کرتے ہیں جو انہیں "بالغ" یا آزاد ظاہر کریں۔

دوسری اہم وجہ ذہنی دباؤ، امتحانی تناؤ، خاندانی مسائل یا کسی ذاتی بحران سے نمٹنے کی ناکام کوشش ہو سکتی ہے۔ تمباکو کا وقتی سکون نوجوانوں کو وقتی طور پر آرام دیتا ہے، مگر طویل المدتی نتائج نہایت خطرناک ہوتے ہیں۔ کئی نوجوان مشہور شخصیات کی نقل میں سگریٹ نوشی شروع کرتے ہیں، خاص طور پر جب فلموں، ڈراموں یا سوشل میڈیا پر تمباکو نوشی کو 'اسٹائلش' بنا کر دکھایا جاتا ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں والدین اور اساتذہ کی جانب سے اس مسئلے پر کھل کر بات نہیں کی جاتی۔ اکثر والدین اپنی اولاد کی عادات سے ناواقف ہوتے ہیں یا ان سے دوستی کے بجائے فاصلہ رکھتے ہیں، جس کی وجہ سے نوجوان اپنے مسائل اور الجھنیں کسی اور انداز میں نکالتے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں بھی تمباکو نوشی کے خلاف کوئی مؤثر آگاہی پروگرام نظر نہیں آتے، اور بعض جگہوں پر اساتذہ خود سگریٹ نوشی کرتے ہیں، جس سے ایک دوہرا معیار جنم لیتا ہے۔

اگرچہ پاکستان میں پبلک مقامات پر سگریٹ نوشی پر پابندی ہے اور تمباکو کی تشہیر کے خلاف بھی قوانین موجود ہیں، لیکن ان پر عملدرآمد بہت کمزور ہے۔ دکاندار بلاخوف کم عمر لڑکوں کو سگریٹ بیچ دیتے ہیں۔ شیشہ کیفے اور ویپنگ شاپس اکثر رہائشی علاقوں میں کھلی ہوتی ہیں، جہاں کوئی نگرانی یا قانونی چیک اینڈ بیلنس نہیں ہوتا۔ کئی بار ایسے کیفے پولیس کی سرپرستی میں بھی چلتے ہیں۔

سوشل میڈیا نے بھی اس رجحان کو بڑھاوا دیا ہے۔ نوجوان جب سوشل میڈیا پر اپنے دوستوں، انفلوئنسرز، یا مشہور شخصیات کو سگریٹ پیتے دیکھتے ہیں، تو وہ خود کو پیچھے محسوس کرتے ہیں۔ ایسے ویڈیوز اور تصاویر جہاں سگریٹ یا شیشہ پینا 'کول' یا 'فن' سمجھا جاتا ہے، وہ براہِ راست نوجوانوں کو متاثر کرتی ہیں۔ بدقسمتی سے سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر بھی ایسے مواد کے خلاف مؤثر مانیٹرنگ نہیں ہو رہی۔

طبی ماہرین کے مطابق سگریٹ نوشی صرف پھیپھڑوں کی بیماریوں، دل کے امراض اور کینسر کا سبب نہیں بنتی بلکہ نوجوانوں میں دماغی کمزوری، توجہ کی کمی، نیند کی خرابی اور ذہنی دباؤ کا باعث بھی بنتی ہے۔ نکوٹین ایک نشہ آور

مادہ ہے جو دماغ پر براہِ راست اثر ڈالتا ہے۔ نوجوان جب اس کا عادی بن جاتے ہیں تو وہ پڑھائی، کریئر اور ذاتی زندگی میں پیچھے رہنے لگتے ہیں۔

سگریٹ نوشی کے بڑھتے رجحان کو روکنے کے لیے صرف قانون سازی کافی نہیں، بلکہ ایک مکمل سماجی، تعلیمی اور نفسیاتی حکمتِ عملی کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے والدین کو چاہیے کہ وہ اپنی اولاد سے دوستی کا رشتہ قائم کریں، ان کے مسائل سنیں اور انہیں درست و غلط میں فرق سکھائیں۔ تعلیمی اداروں کو چاہیے کہ وہ تمباکو نوشی کے خلاف باقاعدہ آگاہی پروگرام چلائیں، اور ساتھ ہی طلبہ کی ذہنی صحت پر بھی توجہ دیں۔

میڈیا، خاص طور پر سوشل میڈیا پلیٹ فارمز، کو چاہیے کہ وہ تمباکو نوشی کو بڑھاوا دینے والے مواد پر کنٹرول کریں اور مثبت طرزِ زندگی کو فروغ دیں۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ نہ صرف قوانین سخت کرے بلکہ ان پر عملدرآمد کو بھی یقینی بنائے۔ عوامی جگہوں، کالجوں اور کیفے جیسے مقامات پر چیکنگ کا نظام وضع کیا جائے، اور تمباکو مصنوعات کی فروخت پر عمر کی حد کو سختی سے لاگو کیا جائے۔

سگریٹ نوشی ایک بیماری ہے، مگر اس سے بھی بڑھ کر یہ ایک سماجی بحران بنتا جارہا ہے جو ہماری نوجوان نسل کی صحت، ذہن، اور مستقبل کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔ اگر ہم نے اب بھی آنکھیں بند رکھیں تو ایک پوری نسل ذہنی و جسمانی کمزوریوں کا شکار ہو کر ملکی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔ وقت آگیا ہے کہ ہم بطور والدین، اساتذہ، پالیسی ساز، اور معاشرہ ایک اجتماعی شعور کے ساتھ اس مسئلے کا سامنا کریں۔ نوجوانوں کو صرف سگریٹ سے نہیں، بلکہ اس کے پیچھے چھپی مایوسی، اضطراب، اور غلط ترجیحات سے بھی بچانا ہو گا۔

# بھارت پاکستان کشیدگی میں میڈیا کا کردار

کرن شاہین ستی

22 اپریل 2025 کو پہلگام، مقبوضہ کشمیر میں کچھ مسلح افراد نے سیاحوں پر فائرنگ کی جس کے نتیجے میں 26 افراد جاں بحق ہوئے۔ ہلاک ہونے والوں میں زیادہ تر بھارت کے مختلف شہروں سے آئے ہوئے سیاح موجود تھے۔ بھارت نے بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے اس واقعے کا سارا ملبہ پاکستان پر ڈال دیا۔ البتہ پاکستان نے ان تمام الزامات کو رد کر دیا۔ جس کے نتیجے میں متاثرہ علاقے میں بھارتی فوج کی حفاظتی اقدامات پر سوال اٹھائے گئے۔ پاکستان نے بھارت کو غیر جانبدار تحقیقات کی پیشکش کی۔ بھارتی حکومت نے پاکستان کی پیشکش رد کرتے ہوئے روایتی انداز اپنائے رکھا۔ اس کے بعد 6 اور 7 مئی کی درمیانی شب 2 بجے بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا جس میں کشمیر اور بہاولپور کے علاقے متاثر ہوئے۔ حملے میں معصوم بچوں سمیت متعدد افراد شہید ہوئے۔ بھارت نے اس جارحیت کو "آپریشن سندور" کا نام دیا۔ جس کی بنیاد پہلگام واقعے کو بنایا گیا۔ اس کے باوجود پاکستان نے صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ اس کے بعد 8 مئی کو بھارت نے بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پاکستان کی فضائی حدود میں داخل ہو کر مختلف شہروں میں میزائل داغ دیے۔ پاکستان کی ایئر بیسز پر حملہ کیا اور معصوم شہریوں کو نشانہ بنایا جس کے نتیجے میں پاکستان نے جوابی کاروائی کی۔ بھارت کی مسلسل خلاف ورزیوں کے باوجود پاکستان نے صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ پاکستان ایک امن پسند ملک ہے جو کہ جنگ نہیں چاہتا تھا۔ بالآخر 10 مئی کی صبح نماز فجر کے بعد پاکستان نے "بنیان مرصوص" کے نام سے آپریشن شروع کیا جس کا مطلب "سیسہ پلائی ہوئی دیوار" ہے۔ اس آپریشن کے تحت پاکستان نے بھارت کی فضائی حدود میں داخل ہو کر بھارت کے ایر بیسز تباہ کیے جن میں پنجاب اور کشمیر کے علاقے شامل تھے۔ اس طرح دونوں ممالک کے درمیان باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔

بالآخر عالمی دباؤ اور خصوصاً امریکہ اور سعودی عرب کی کوششوں کے بعد بھارت اور پاکستان نے 10 مئی کی شام 5 بجے جنگ بندی پر اتفاق کیا۔ اس کشیدگی کے دوران پاکستانی عوام کے جذبات میں قومی یکجہتی کی ایک نئی لہر دیکھنے کو ملی۔ ان تمام حالات کے دوران دونوں ممالک کے میڈیا نے بھی اپنا کردار نبھایا۔ پاکستانی عوام نے بھارتی جارحیت کے خلاف سوشل میڈیا پر شدید احتجاج کیا۔ جس میں "پاکستان زندہ باد" اور "پاک فوج زندہ باد" جیسے

نعروں کا استعمال کیا۔ یہ نہ صرف فوج کی حمایت کا اظہار تھے بلکہ قومی یکجہتی اور دفاعی عزم کی علامت بھی تھے۔ دونوں ممالک کی حکومتوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے میڈیا کو طاقتور ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ بھارت میں حکومت نے میڈیا کی آزادی کو محدود کرتے ہوئے صرف سرکاری بیانیے کو فروغ دیا۔ "گودی میڈیا" نے پاکستان کو دہشت گردی کا سرپرست قرار دیتے ہوئے جنگی بیانات اور جذباتی تقاریر کی بھرمار کی۔ بھارتی حکومت نے میڈیا کو ہدایات دیں کہ وہ صرف سرکاری بیانیے کو پیش کریں۔ سوشل میڈیا پر بھی بھارت نے پاکستانی یوٹیوب چینلز اور نیوز ویب سائٹس تک رسائی محدود کی، اور غلط معلومات پھیلا کر پاکستان کے خلاف مہم چلائی۔ پاکستانی میڈیا نے بھارتی جارحیت کو اجاگر کرتے ہوئے اپنی قوم کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ نیوز چینلز نے کشمیر میں بھارتی مظالم، فوجی کارروائیوں اور پانی کے تنازعات پر خصوصی رپورٹس نشر کیں۔ حکومتی وزراء نے بھی میڈیا پر آکر پاکستان کی دفاعی تیاریوں اور جوابی کارروائیوں کے بارے میں عوام کو آگاہ کیا۔ سوشل میڈیا پر پاکستانی عوام نے "پاکستان زندہ باد" جیسے نعرے اپنانے شروع کیے، جس سے قومی یکجہتی کو فروغ ملا۔

میڈیا نے اس کشیدگی میں محض اطلاعات کی ترسیل کا نہیں بلکہ دونوں ممالک کے بیانیے، عوامی جذبات اور بین الاقوامی رائے کو تشکیل دینے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔

# خاندانی نظام اور مغربی اثرات

نتالیہ سلیم

کبھی ہمارے گھروں میں زندگی ہوا کرتی تھی۔ دادا ابو کی باتیں، دادی اماں کی دعائیں، ماں کا پیار، ابو کی شفقت، بہن بھائیوں کی ہنسی مذاق... سب کچھ ایک ہی چھت کے نیچے ہوتا تھا۔ ہر کوئی ایک دوسرے کے ساتھ جُڑا ہوتا تھا۔ رشتے صرف نام کے نہیں ہوتے تھے، دلوں کے قریب ہوتے تھے۔ لیکن اب سب کچھ بدلتا جارہا ہے۔

اب لگتا ہے جیسے گھر صرف رہنے کی جگہ بن گئے ہیں۔ ہر کوئی اپنے کمرے میں بند، موبائل فون اور ٹی وی میں مصروف۔ نہ ایک ساتھ بیٹھنا، نہ کھانا کھانا، نہ باتیں کرنا۔ لگتا ہے جیسے گھر ہوٹل بن گئے ہیں، جہاں لوگ صرف سونے یا کھانے آتے ہیں۔

یہ سب کچھ ایسے ہی نہیں ہوا۔ ہم نے آہستہ آہستہ مغرب کے اندازِ زندگی کو اپنانا شروع کر دیا ہے۔ وہاں بچوں کو جوان ہوتے ہی خود مختار کر دیا جاتا ہے، وہ الگ گھر میں رہنے لگتے ہیں، اور ماں باپ کو اولڈ ہومز میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ سب اپنی اپنی زندگی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم بھی وہی سب کچھ اپنا رہے ہیں۔ ہم یہ جملے سننے لگے ہیں:

"بس اپنی زندگی جیو"

"کسی کی بات مت سنو"

"صرف خود خوش رہو"

لیکن ہم یہ بھول گئے ہیں کہ ہماری خوشی ہمیشہ سے ہمارے اپنے لوگوں کے ساتھ جڑی رہی ہے۔

پہلے اگر گھر میں کوئی پریشانی آتی تھی تو سب مل کر اس کا حل ڈھونڈتے تھے۔ اب اگر کوئی مسئلہ ہو جائے تو سب خاموش ہو جاتے ہیں، یا ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں۔ رشتے اب پہلے جیسے مضبوط نہیں رہے۔

ہمیں سوچنے کی ضرورت ہے: کیا واقعی مغربی طریقہ ہمارے لیے ٹھیک ہے؟ کیا ہم ترقی کے نام پر اپنی محبتیں، اپنے رشتے، اور اپنے بڑوں کا احترام چھوڑ دیں؟

ہمیں اپنے خاندانی نظام کو بچانا ہو گا۔ اپنے بچوں کو سکھانا ہو گا کہ دادا دادی صرف کہانیوں کے کردار نہیں بلکہ ہمارے اصل رہنما ہیں۔ ماں باپ کے قدموں تلے جنت ہے، یہ صرف ایک بات نہیں، حقیقت ہے۔ اگر ہم نے اپنے بڑوں کو دور کر دیا تو کل کو ہمارے بچے بھی ہمیں ایسے ہی بھول جائیں گے۔

رشتے نبھانا آسان نہیں، وقت اور توجہ مانگتے ہیں۔ لیکن یہی رشتے زندگی کو خوبصورت بناتے ہیں۔ اگر ہم نے انہیں چھوڑ دیا، تو ہم خود بھی تنہا رہ جائیں گے۔

خاندانی نظام ہماری پہچان ہے، ہماری طاقت ہے۔ ہمیں اسے صرف یاد نہیں رکھنا، بلکہ زندہ رکھنا ہے۔ یہ ہم سب کی ذمہ داری ہے

# سوشل میڈیا کا استعمال اور نوجوانوں کے بدلتے رویے

ربیعہ عروج

آج کا دور بلاشبہ ایک ڈیجیٹل دور ہے جہاں معلومات بہت تیزی سے پھیلتی ہیں۔ فیس بک انسٹا گرام ٹک ٹاک یوٹیوب اور ایکس جیسے سوشل میڈیا پلیٹ فارمز نے دنیا کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے اسے ہم گلوبل ویلج کا نام بھی دیتے ہیں۔ نوجوان نسل ان پلیٹ فارمز کا سب سے زیادہ استعمال کر رہی ہے۔۔ لیکن یہ صرف تفریح اور معلومات تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ اس نے لوگوں کی سوچنے کے انداز ان کے رویے اور زندگی گزارنے کے طریقوں میں بھی تبدیلی لائی ہے۔۔

سب سے نمایاں چیز یہ ہے کہ نوجوانوں کی بات چیت کرنے کا انداز ہی بدل گیا ہے۔ لمبی اور روایتی بات چیت کرنے کے بجائے چھوٹے پیغامات ایموجیز اور انگریزی سلیگ زبان استعمال کی جارہی ہے۔۔ جس کی وجہ سے رسمی اور باادب گفتگو بہت کم تقریباً نہ ہونے کے برابر ہو گئی ہے۔۔ جو کہ نوجوانوں کے مستقبل کے لیے خطرے کی گھنٹی بجا سکتی ہے۔

اس پلیٹ فارم کے ابھرنے کا ایک اور بڑا نقصان یہ بھی ہوا کہ نوجوانوں کے اندر برداشت کا عنصر بالکل ختم ہو گیا، مذہبی اور سیاسی لیڈران کے پیچھے ایسے لڑرہے ہوتے ہیں جیسے سالوں کی دشمنی ہو، نہ ہی دوسروں کی رائے کا احترام کرتے ہیں اور نہ ہی کسی کے نظریے کو برداشت۔

سوشل میڈیا کے زیادہ استعمال نے نوجوانوں کے وقت کو بھی بدل دیا ہے پہلے وہ کتابیں پڑھتے تھے کھیلتے تھے یہ گھر والوں کے ساتھ وقت گزارتے تھے لیکن اب ان کا یہ سارا وقت موبائل یا لیپ ٹاپ اسکرین پر گزرتا ہے جس سے بہت ساری بیماریاں جیسے کہ نیند کی کمی انکھوں کے مسائل اور ذہنی تھکن جیسے مسائل بڑھ گئے ہیں۔

اسی کے برعکس اگر تصویر کا دوسرا رخ دیکھا جائے تو سوشل میڈیا کا استعمال اگر سمجھداری سے کیا جائے تو یہ بہت فائدہ مند بھی ہو سکتا ہے کئی نوجوانوں نے انہی پلیٹ فارمز پر اپنی صلاحیتیں دکھا کر شہرت حاصل کی، کاروبار

شروع کیے، ڈھیر سارا پیسہ کمایا، لوگوں کو بیدار کیا یا دوسروں کی مدد کے لیے مثبت پیغامات پھیلائے جس کے اثرات ہمیں آج معاشرے میں دکھائی دیتے ہیں۔۔

سوشل میڈیا پر جعلی خبریں اور ان کے نقصانات

سوشل میڈیا پر جعلی خبروں کا پھیلاؤ آج ایک سنگین مسئلہ بن چکا ہے۔ کوئی بھی فرد بغیر تحقیق کیے کوئی بھی خبر شیئر کر دیتا ہے، جو کہ خطرناک نتائج کا باعث بن سکتی ہے۔

افواہوں کا پھیلاؤ، جھوٹی خبریں معاشرے میں خوف، بے چینی اور غلط فہمی پیدا کرتی ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات جیسے کہ بعض جعلی خبریں مذہبی یا لسانی بنیاد پر نفرت پھیلاتی ہیں، جس سے معاشرتی ہم آہنگی متاثر ہوتی ہے۔ شخصی کردار کشی یعنی جھوٹی خبروں سے کسی فرد کی عزت اور شہرت کو نقصان پہنچایا جا سکتا ہے۔ غلط فیصلے جیسے بعض اوقات جعلی طبی یا تعلیمی معلومات کی بنیاد پر لوگ اہم فیصلے کر لیتے ہیں، جو ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ سیاسی انتشار اور انتخابات یا اہم مواقع پر پھیلائی جانے والی جھوٹی خبریں عوامی رائے کو گمراہ کر سکتی ہیں۔

آخر میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ سوشل میڈیا نے نوجوانوں کے رویے کو ضرور بدل دیا ہے۔۔ اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اسے سمجھداری سے استعمال کریں۔ اگر توازن، وقت کی پابندی اور شعور کے ساتھ استعمال کیا جائے تو سوشل میڈیا ہمارے لیے ایک مفید ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے نہ کہ نقصان دہ۔

# میری وائی فائی میرے رشتوں سے زیادہ مضبوط کیوں ہے؟

شانزہ گلستان

آج کل کے دور میں اگر کوئی چیز مستقل، وفادار، ہر وقت دستیاب اور سب سے بڑھ کر سمجھ دار ہے، تو وہ ہے ہماری وائی فائی۔ دل کی دنیا میں چاہے جتنے بھی طوفان آئیں، تعلقات جتنے بھی الجھیں یا بکھریں، ایک چھوٹا سا راؤٹر کونے میں چپ چاپ، بغیر کسی شکایت کے اپنی پوری طاقت کے ساتھ سگنل بھیجتا رہتا ہے۔ انسانوں کے رشتے تو لمحوں میں بدل جاتے ہیں، مگر وائی فائی اپنی جگہ پر قائم و دائم رہتی ہے، جب تک کے بل ادا ہوتے رہیں۔

یہ ایک عجیب مگر سچائی سے بھرا موازنہ ہے کہ آج کا انسان اپنے جذباتی تعلقات سے زیادہ اپنی انٹرنیٹ کنیکٹیوٹی پر انحصار کرتا ہے۔ آپ کسی کے پیغام کا گھنٹوں انتظار کر سکتے ہیں، مگر جیسے ہی نیٹ ورک بند ہوتا ہے، فوراً حرکت میں آجاتے ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم اپنے رشتوں میں بھی وہی توجہ کیوں نہیں دے پاتے جو ہم وائی فائی کو دیتے ہیں؟ جب سگنل کمزور ہوں تو ہم راؤٹر ری اسٹارٹ کرتے ہیں، رینج ایکسٹینڈر لگاتے ہیں، زاویے بدلتے ہیں، مگر جب تعلقات کمزور پڑ جائیں تو ہم اکثر خاموشی، لاپرواہی اور بیزاری اختیار کر لیتے ہیں۔

وائی فائی کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ اگر سگنل کمزور ہے تو سیدھا ظاہر کر دیتی ہے۔ بند ہے تو بند ہے، چل رہی ہے تو پوری رفتار سے۔ انسانوں کے رشتے ایسے نہیں ہوتے۔ یہاں ایک بات کہی جاتی ہے اور مطلب کچھ اور ہوتا ہے۔ دل میں کچھ اور ہوتا ہے، زبان پر کچھ اور۔ ایک دن پیار جتاتے ہیں، اگلے دن "مجھے تھوڑا اسپیس چاہیے" کا بہانہ آجاتا ہے۔ وائی فائی کبھی جذباتی نہیں ہوتی، نہ ہی اس کا موڈ خراب ہوتا ہے، نہ ہی وہ پرانی باتوں کی فائلیں نکال کر یاد دلاتی ہے۔

انسانی تعلقات کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ بہت جلدی تھک جاتے ہیں۔ پہلے دنوں میں تو خوب سگنل آتے ہیں، باتیں ہوتی ہیں، رابطے ہوتے ہیں، لیکن جیسے ہی کچھ وقت گزرتا ہے، وہ سگنلز دھندلے ہونے لگتے ہیں۔ ایک وقت آتا ہے کہ مکمل "نو کنکشن" کا نوٹیفیکیشن آجاتا ہے۔ وائی فائی کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا، جب تک آپ اسے سنبھالتے رہیں، وہ کبھی آپ کو تنہا نہیں چھوڑتی۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جیسے ہی وائی فائی کا سگنل کمزور ہوتا ہے، ہم فوراً حرکت میں آ جاتے ہیں۔ تکنیکی مدد لیتے ہیں، سیٹنگز چیک کرتے ہیں، ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ نیٹ ورک واپس بحال ہو جائے۔ کیا ہم اپنے رشتوں کے لیے بھی اتنے ہی حساس ہوتے ہیں؟ جب کوئی بات کرنا چھوڑ دے، پیغام کا جواب نہ دے، یا روٹھ جائے تو ہم کتنی بار سچ میں کوشش کرتے ہیں کہ اسے منائیں، بات کریں، مسئلے کی جڑ تک پہنچیں؟ اکثر اوقات ہم خود کو تسلی دے لیتے ہیں کہ "چھوڑو، جسے جانا ہو وہ چلا جائے"، مگر وائی فائی بند ہو جائے تو ہمیں ایک پل بھی چین نہیں آتا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہم وائی فائی کی پرائیویسی کی بھی خوب حفاظت کرتے ہیں۔ پاسورڈ لگاتے ہیں، صرف ان لوگوں کو دیتے ہیں جن پر بھروسہ ہو، اور جب کوئی انجان بندہ کنیکٹ کرنے کی کوشش کرے تو فوراً بلاک کر دیتے ہیں۔ مگر تعلقات میں اکثر دل کھلا چھوڑ دیتے ہیں، ہر کسی کو اندر آنے دیتے ہیں، اور جب دل پر وائرس آ جائے، تو دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

پبلک وائی فائی کا بھی اپنا تجربہ ہوتا ہے۔ ابتدا میں تو بڑی سہولت لگتی ہے، مفت انٹرنیٹ، کوئی پاسورڈ نہیں، سب آسان۔ لیکن جیسے ہی ذرا دیر رکیں، سیکیورٹی کا خطرہ، سپیڈ کی کمی، اور بار بار ڈس کنیکٹ ہونے کی پریشانی شروع ہو جاتی ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے کچھ تعلقات ہوتے ہیں—وقتی، چمکدار، مگر غیر محفوظ۔ تھوڑا وقت اچھا لگتا ہے، لیکن جیسے ہی دل لگنے لگے، وہی تعلق بوجھ بن جاتا ہے۔

راؤٹر کبھی شکوہ نہیں کرتا۔ چپ چاپ کام کرتا ہے، چاہے اس کے ساتھ کوئی بات کرے یا نہ کرے۔ مگر انسان؟ اگر اسے توجہ نہ ملے، وقت نہ دیا جائے، یا وہ محسوس کرے کہ آپ اب دلچسپی نہیں رکھتے، تو وہ یا تو خاموشی سے دور ہو جائے گا یا شور مچا دے گا۔ رشتہ بچانے کے لیے مستقل رابطہ ضروری ہے۔ جیسے وائی فائی کے سگنلز کے لیے قریب رہنا ضروری ہے، ویسے ہی انسانی تعلق کے لیے احساس، گفتگو، اور وقت دینا ضروری ہے۔

ہمیں یہ بھی سیکھنا چاہیے کہ جس طرح وائی فائی کے ساتھ ہم اپنی ترجیحات سیٹ کرتے ہیں—جیسے کہ کس ڈیوائس کو کتنی رفتار ملے گی—ویسے ہی رشتوں میں بھی توازن رکھنا چاہیے۔ ہر کسی کو ایک جیسا وقت دینا ممکن

نہیں ہوتا، لیکن جس سے وابستگی ہو، اسے کم از کم یہ احساس ہونا چاہیے کہ وہ اہم ہے، قابلِ بھروسہ ہے، اور نظر انداز نہیں کیا جا رہا۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اگر انسان بھی وائی فائی کی طرح ہوتے — سگنل دے کر بتاتے کہ وہ کیسے محسوس کر رہے ہیں، کتنی دوری سے بات کمزور ہو رہی ہے، کب ضرورت ہے دوبارہ کنیکٹ ہونے کی — تو زندگی کتنی آسان ہوتی۔ مگر افسوس، انسان جذباتی ہوتے ہیں، پیچیدہ ہوتے ہیں، اور اکثر خود بھی نہیں سمجھ پاتے کہ انہیں کیا چاہیے۔

شاید ہم سب کو چاہیے کہ وائی فائی سے کچھ سیکھیں. مستقل مزاجی، خاموشی سے مدد، بغیر شکوہ ساتھ دینا، اور وقت پر سگنل دینا۔ اگر ہم اپنے تعلقات میں بھی تھوڑا سا وائی فائی جیسا رویہ اپنا لیں، تو نہ دل ٹوٹیں، نہ لوگ بچھڑیں۔ تب تک، میں اپنی وائی فائی کے ساتھ خوش ہوں۔ وہ کم از کم ہر رات سوتے وقت میرے پاس ہوتی ہے، بغیر کسی ڈرامے کے، بغیر کسی امید کے، صرف خاموش خدمت کے ساتھ

# فٹ بال عالمی کپ کی تاریخ، یادگاری لمحات اور بڑے کھلاڑی..

## تابش خان

۔دنیا میں بہت سے کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ لیکن فٹبال سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا کھیل ہے۔ فٹبال صرف ایک کھیل نہیں ہے یہ ایک جذبہ ہے لوگ اسے بڑے شوق سے دیکھتے ہیں۔ جب بھی فیفا ورلڈ کپ آتا ہے، دنیا کے کروڑوں لوگ بہت خوش ہوتے ہیں اور اپنی پسندیدہ ٹیموں کو سپورٹ کرتے ہیں۔فیفا ورلڈ کپ کی شروعات کی بات کی جائے تو فیفا ورلڈ کپ سب سے پہلے 1930 میں ہوا تھا۔ یہ مقابلہ جنوبی امریکہ کے ایک مُلک یوراگوئے میں منعقد ہوا۔ اُس وقت صرف 13 ٹیموں نے حصہ لیا تھا۔ اور یوراگوئے ہی اوس کی فاتح رہی لیکن آج کل دیکھا جائے تو اس ٹورنامنٹ میں 32 ٹیمیں کھیلتی ہیں۔ اور اگلے ورلڈ کپ میں 48 ٹیمیں شامل ہوں گی جو اب تک کے لحاظ سے سب سے زیاداں ہیں۔فیفا ورلڈ کپ ہر چار سال بعد ہوتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کی سب سے اچھی ٹیم کو چیمپیئن بنایا جائے۔ جب ورلڈ کپ ہوتا ہے۔ تو بہت سی قومیں ایک ساتھ خوشی مناتی ہیں۔ اسی طرح کچھ سب سے مشہور کھلاڑیوں کی بات کی جائے تو فیفا ورلڈ کپ کی تاریخ میں کئ مشہور کھلاڑی گزرے ہیں جنہوں نے شاندار کھیل دکھایا۔ جس میں سب سے پہلا نام پیلاے (Pele) کا آتا ہے پیلاے برازیل کے سٹار فٹبالر تھے۔ جنہوں نے تین ورلڈ کپ جیتے۔ اور وہ دنیا کے کم عمر ترین پلیئر تھے جنھوں نے ورلڈ کپ فائنل میں گول سکور کیا یہ ورلڈ ریکارڈ آج تک نہیں ٹوٹ سکا اُن کا شمار دنیا کے کچھ سب سے بڑے کھلاڑیوں میں کیا جاتا ہے. ڈیاگو میراڈونا۔ ارجنٹینا کے سٹار کھلاڑی تھے۔ انہوں نے 1986 میں اپنی ٹیم کو ورلڈ کپ جتوایا۔ اُن کا "ہینڈ آف گاڈ" گول بہت مشہور ہے۔ زین الدین زیدان: فرانس کے ایک مسلمان کھلاڑی تھے۔ انہوں نے 1998 میں اپنی ٹیم کو پہلا ورلڈ کپ جتوایا۔ ارجنٹینا کے لیونل میسی۔ جو کے دنیائے فٹبال میں ایک بہت بڑا نام ہیں۔ جو بہت لمبے ارسے تک اپنی ٹیم کو کوئی انٹرنیشنل ٹرافی نا جیتا سکے تھے جس کی وجہ سے اونہے بہت تنکید کا بھی سامنا کرنا پڑھا اخر کار 2022 میں اپنا پہلا ورلڈ کپ جیتنے میں کامیاب رہے۔ کرسٹیانو رونالڈو۔ پرتگال کے مشہور کھلاڑی

ہیں۔ جو دنیا میں سب سے زیادہ پسند کیے جانے والے پلیئرز میں سے ہیں۔ جنہوں نے فٹبال کو ایک نئ پہچان دی سب سے زیادہ گول کرنے کا ریکارڈ بھی اُن کے پاس ہے۔ لیکن بد قسمتی سے اب تک کوئی ورلڈ کپ جیت نہیں سکے۔ ایک اور اوبھرتے ہوئے ستارے کی بات کی جائے تو فرانس کے کلیان امباپے۔ کا نام سامنے آتا ہے جو ورلڈ کپ میں بڑے کامیاب رہے ہیں جنہوں نے اب تک سرف دو ورلڈ کپ کھیلے ہیں اور دونوں بار اپنی ٹیم کو فائنل تک لے جانے میں کامیاب رہے ہیں ایک بار جیتنے میں کامیاب رہے اور ایک بار ہار کا سامنا کرنا پڑا کلیان امباپے۔ دنیا کے دوسرے ایسے پلیئر ہیں جنہوں نے ورلڈ کپ فائنل میں ہیٹرک سکور کی اس سے پہلے انگلینڈ کے جف ہرسٹ. نے 1966 کے ورلڈ کپ میں ویسٹ جرمنی کے خلاف یہ کارناما انجام دیا تھا۔۔ یادگار لمحات کی بات کی جائے تو فیفا ورلڈ کپ میں بہت سے ایسے لمحات ہوتے ہیں جو ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔۔ 2006 کے ولڈ کپ فائنل میں زین الدین زیدان کا اٹلی کے کھلاڑی کو سر سے وار اور اُس کے بعد میچ کے آخری لمحات میں ریڈ کارڈ ہو جانا بھی ایک یادگار لمحا تھا. اور اسی طرح روبیٹو باجیو کی 1994 کے ورلڈ کپ کی کہانی بھی بڑی مشہور ہے۔ 1994 ورلڈ کپ فائنل میں، اٹلی اور برازیل کا میچ برابر ہو گیا۔ فیصلہ پینلٹی پر ہوا۔ روبیٹو باجیو نے آخری پینلٹی لی، لیکن گیند گول کے اوپر چلی گئی۔ اٹلی ہار گیا اور یہ لمحہ باجیو کی زندگی کا سب سے دکھ بھرا لمحہ بن گیا۔ اس لمحے کو یادگاری طور پر اس جملے سے یاد کیا جاتا ہے۔.

The man who died standing

اور 2014 میں جب جرمنی نے برازیل کو 1-7 سے ہرایا۔ یہ ایک حیران کن جیت تھی کیونکہ برازیل اپنے ملک میں کھیل رہا تھا۔ 2022 میں۔ ارجنٹینا نے فرانس کو فائنل میں پینلٹی شوٹ آوٹ میں ہرایا۔ یہ میچ بہت سنسنی خیز تھا۔ اور میسی نے اپنا پہلا ورلڈ کپ جیتا۔۔ ورلڈ کپ کیوں خاص ہوتا ہے؟ ورلڈ کپ خاص اس لیے ہوتا ہے کیونکہ یہ صرف کھیل نہیں۔ بلکہ خوشی۔ اتحاد اور دوستی کا پیغام ہوتا ہے۔ اس موقع پر دنیا کے لوگ ایک

ساتھ ہوتے ہیں، اپنی ٹیموں کے لیے نعرے لگاتے ہیں اور بہت خوشی مناتے ہیں۔ یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ محنت، ٹیم ورک۔ اور صبر سے ہم کچھ بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ اگلا فیفا ورلڈ کپ 2026 میں ہو گا۔ یہ تین ملکوں میں کھیلا جائے گا جس میں امریکہ، کینیڈا اور میکسیکو شامل ہیں اس بار 48 ٹیمیں کھیلیں گی۔ جو اب تک کا ورلڈ ریکارڈ ہو گا اب تک برازیل نے سب سے زیادہ پانچھ بار یہ مقالہ جیتا ہے اٹلی اور جرمنی نے چار چار مرتبہ ارجنٹینا نے تین فرانس اور یوراگوئے نے دو دو مرتبہ سپین اور انگلینڈ نے ایک ایک مرتبہ یہ مقالہ جیتا ہے۔۔ نتیجہ فیفا ورلڈ کپ دنیا کا سب سے دلچسپ ٹورنامنٹ ہے۔ اس سے ہمیں سیکھنے کو ملتا ہے کہ کھیل صرف جیتنے کا نام نہیں، بلکہ سیکھنے جوڑنے اور ایک دوسرے کی عزت کرنے کا نام ہے۔ ہم سب کو اس سے لطف اندوز ہونا چاہیے اور سیکھنا چاہیے کہ کھیل ہمیں کس طرح بہتر انسان بناتا ہے۔

# مسئلہ کشمیر!آخر کب تک؟

عدنان خلیل

سنا ہے بہت سستا ہے خون وہاں کا

ایک بستی جسے لوگ کشمیر کہتے ہیں

کشمیر دلکش خوبصورتی اور پیچیدہ تاریخ کا خطہ ہے جس کی وجہ سے کشمیر توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے کشمیر میں انگنت پہاڑ وادیاں درخت بے شمار چیزیں جو انسان کو اپنی طرف کھینچے جانے پر مجبور کر دیتی ہے اس بے بہا خوبصورتی کے باوجود کشمیر کا ہر شہری جان ہتھیلی پہ لیے پھرتے ہیں کشمیری تنازہ صدیوں سے چلتا پاکستان اور بھارت کی تقسیم کے بعد یہ تنازہ منظر عام پر ایا اگر ہم کشمیر کے مسئلے کی بات کریں تو پاک بھارت کی ازادی کے بعد سے ہی کشمیر کا مسئلہ شروع ہو گیا 14 اگست 1947 کو پاکستان کو تو ازادی مل گئی اور 15 اگست 1947 کو بھارت کو بھی ازادی مل گئی لیکن مسئلہ حل نہ ہوا تو کشمیر کا مسئلہ ہی حل نہ ہو سکا نہ صرف کشمیر بلکہ دیگر علاقوں کے بھی مسائل حل نہ ہو سکے آزادی کے بعد فیصلہ نہ ہونے والے علاقوں میں کشمیر بھی شامل ھے اگر ھم کشمیر کے مسئلے کی بات کریں تو پاکستان اور بھارت کے بیچ میں کشمیر ایک بڑا تناؤ کا سبب رہا ہے دونوں ملکوں نے کشمیر پر اپنا حق جتایا ھوا ہے اور اور کشمیر کی وجہ سے دونوں ملکوں میں کئی جنگیں لڑی جا چکی ہیں اگر ہم کشمیر کے ابتدائی مسئلے پر بات کریں تو تو 1947 میں بھارت اور پاکستان کے بٹوارے کے بعد شروع ہوا اس وقت مہاراجہ ہری سنگھ نے کشمیر کو بھارت میں ملانے کا فیصلہ کیا لیکن کشمیر کے کچھ لوگوں نے پاکستان کے ساتھ ملنے کی مانگ کی کشمیری عوام نے کہا کہ ہمیں اپنا فیصلہ خود کرنے کی اجازت ملنی چاہیے لیکن پاک بھارت کی دشمنی نے اس مسئلے کو اور بھی بدترین بنا دیا اس کے بعد اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کئی جتن کیے گئے لیکن سب ناکام رہے کشمیر کے مسئلے پہ پاک بھارت کی جنگیں شروع ہو گئے ہیں جن میں چار جنگیں بڑی ہی مشہور ہیں ہم ان جنگوں کے بارے میں بات کریں تو پہلی جنگ 1947-1948 میں ہوئی یہ جنگ کشمیر کے معاملے پر ہوئی تھی اس جنگ میں پاکستان نے اپنی افواج کو کشمیر میں داخل کرنے کا فیصلہ کیا اس جنگ کے نتیجے میں پاکستان کے حصے میں ایک کشمیر کا حصہ ایا جب کہ دوسرا حصہ بھارت کے حصے میں

ایااس جنگ کے بعد 1965 میں پاک بھارت کشمیر کے مسئلے پہ امنے سامنے ہوئے 1965 کی جنگ میں پاکستان نے اپنی افواج کو بھارت میں بھیجنا چاہالیکن بھارت نے اس کو ناکام بنادیااس کے بعد کئی دنوں تک جنگ جاری رہنے کے بعد اخر کار سیز فائر کے بعد یہ فیصلہ طے پایاکے بات چیت سے معاملات حل کرنے پڑیں گے اور کشمیر کا مسئلہ صرف بات چیت سے ہی حل ہو سکتا ہے اس کے بعد تیسری بڑی جنگ 1971 میں ہوئی بظاہر یہ جنگ بنگلہ دیش کی ازادی کے لیے تھی لیکن اس میں کشمیر کا مسئلہ بھی شامل تھا جس میں بنگلہ دیش کی ازادی کے لیے انڈین افواج نے ان کی مدد کی جس سے بنگلہ دیش کو الگ ملک ملا اور بنگلہ دیش کو ازادی ملی اور ایک الگ ملک بنالیکن پاکستان کی افواج کمزور نظر ائی اور کشمیر کا مسئلہ وہیں کا وہیں رہا اس کے بعد 1999 میں کارگل کی جنگ شامل ہے یہ جنگ پاکستان اور بھارت کے بیچ میں ہوئی جس میں کشمیر کے ایک علاقے کارگل میں لڑائی لڑی گئی اس جنگ میں بھی پاکستان نے اپنی افواج کو کارگل میں بھیجنے کے لیے ناکام کوشش کی لیکن بھارت نے ان کے ارادوں کو ناکام کر دیا لڑائی کہیں دن جاری رہنے کے بعد سیز فائر پر سمجھوتہ کیا گیا اور بیٹھ کر مسائل کا حل نکالنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی لیکن بڑی جنگوں کے علاوہ کئی چھوٹی جنگی بھی لڑی گئی ہیں جو اج تک جاری ہیں کشمیر کے کئی مقامات پر اج بھی فائرنگ جاری رہتی ہے جس کے نتیجے میں کئی نہتے کشمیری جان کی بازی ہار جاتے ہیں اور اچھا میں شہادت نوش کرتے ہیں کشمیر کا ہر ایک نوجوان اپنی جان ہتھیلی پر لیے بیٹھا ہوتا ہے لیکن کشمیر کا مسئلہ حل ہونے پر نہیں اتا کشمیری اپنے الگ وطن کا مطالبہ کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی ایک الگ ریاست اور الگ پہچان بنا سکے اس کے بعد گزشتہ روز کی جانے والی چینل پاک بھارت میں کشمیر کو نشانہ بنایا گیا کشمیر کے کئی علاقوں پر حملہ کیا گیا اور تقریباً 30 سے زاہد نہتے کشمیریوں کو شہید کر دیا گیا لیکن ہمارا سوال یہ ہے کہ اخر کب تک ایسے معصوم نوجوان معصوم کشمیری ہر روز جان کی بازی ہاریں گے اور ازادی کے لیے لڑتے رہیں گے کیا کشمیر کے نصیب میں ازادی نہیں ہے اتنی ساری بڑی جنگوں کے باوجود بھی کشمیر کا فیصلہ کیوں نہ ہو پایا اج تک کیا کشمیریوں کو ازادی کا حق نہیں ہے کشمیر کا صرف ایک ہی نعرہ لگتا ہے کہ (کشمیر بنے گا خود مختار)

# شاہد آفریدی کا گلگت بلتستان کا دورہ حقیقت کیا ہے؟

احمد شاہ

گزشتہ دنوں شاہد آفریدی کے گلگت بلتستان کے دورے پر سوشل میڈیا اور بعض حلقوں میں غیر ضروری تنازع کھڑا کر دیا گیا۔ حالانکہ اس دورے کا مقصد خالصتاً کرکٹ سے جڑا ہوا تھا، نہ کہ کسی سیاسی ایجنڈے یا علاقائی مفاد کے خلاف کوئی کارروائی۔

کشمیر پریمیئر لیگ (KPL) ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جو نوجوان کھلاڑیوں کو آگے آنے کا موقع دیتا ہے۔ اس سال یہ لیگ مظفر آباد، اسلام آباد اور پاکستان کے مختلف کرکٹ اسٹیڈیمز میں کھیلی جا رہی ہے، جس میں ملک کے مختلف علاقوں سے 8 ٹیمیں حصہ لے رہی ہیں۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ گلگت بلتستان کی ٹیم بھی اس سپر لیگ کا حصہ ہے، اور باقاعدہ مقابلوں میں شرکت کرے گی۔ شاہد آفریدی بطور KPL کے برانڈ ایمبیسیڈر 17 تاریخ کو گلگت بلتستان گئے تاکہ گلگت ڈویژن، دیامر ڈویژن، اور بلتستان ڈویژن سے نوجوان کھلاڑیوں کے ٹرائلز کا انعقاد کیا جا سکے۔ یہ ایک مثبت قدم تھا تاکہ پسماندہ علاقوں کے نوجوانوں کو قومی سطح پر اپنی صلاحیتیں دکھانے کا موقع مل سکے۔

افسوس کی بات ہے کہ بعض عناصر نے اس خالص کرکٹنگ دورے کو ایک سازش بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی۔ لوگوں کو پروپیگنڈہ پر یقین دلایا گیا کہ آفریدی کا دورہ دراصل معدنیات پر سودے بازی یا عوام کی توجہ ہٹانے کا ذریعہ ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر معدنیات کے سودے ہوئے بھی ہیں تو وہ پہلے سے طے شدہ حکومتی یا نمائندہ معاہدے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ آخر کب تک ہم ہر مثبت اقدام کو شک کی نظر سے دیکھتے رہیں گے؟ کیا ہم واقعی چاہتے ہیں کہ ہمارے نوجوانوں کو موقع نہ ملے؟ کیا ہمیں ہر اس شخصیت کو متنازعہ بنانا ہے جو علاقے میں ترقی کا پیغام لے کر آئے؟

ہمیں سوچنا ہو گا۔ کرکٹ ایک کھیل ہے جو علاقے، زبان اور قوم سے بالاتر ہو کر لوگوں کو جوڑتا ہے۔ شاہد آفریدی کا مشن نوجوان کھلاڑیوں کو ابھارنا ہے، نہ کہ کسی پوشیدہ ایجنڈے کو فروغ دینا۔ آئیں، ہم پروپیگنڈے سے باہر نکل کر حقیقت کو اپنائیں اور ایسے اقدامات کی حوصلہ افزائی کریں جو ہمارے نوجوانوں کو ایک روشن مستقبل کی طرف لے جا سکیں

شاہد آفریدی نہ صرف ایک عظیم کھلاڑی ہیں بلکہ نوجوانوں کے لیے ایک رول ماڈل بھی ہیں۔ ان کا گلگت بلتستان آنا ایک مثبت پیغام تھا کہ پاکستان کے ہر کونے میں ٹیلنٹ موجود ہے اور اب اسے پلیٹ فارم بھی دیا جا رہا ہے۔

لہٰذا، آیئے ہم پروپیگنڈے سے نکل کر حقیقت کو اپنائیں، اور کرکٹ جیسے مثبت اور یکجہتی پیدا کرنے والے کھیل کو متنازعہ بنانے سے گریز کریں۔

# نقش کہسار سرزمین ہزارہ

اریبہ حبیب عباسی

پاکستان میں ہزارہ ڈویژن صوبہ خیبر پختونخوا کا ایک انتظامی خطہ ہے جو اپنے سرسبز پہاڑوں اور تاریخی مقامات کی وجہ سے جانا جاتا ہے اس خطے کی تاریخ قدیم ادوار سے جاملتی ہے گندھارا تہذیب کے آثار یہاں پائے جاتے ہیں مختلف ادوار میں یہ خطہ مختلف سلطنتوں اور حکمرانوں کے زیر نگیں رہا، جن میں گندھارا، ہندو شاہی، محمود غزنوی، مغلیہ سلطنت، سکھ سلطنت اور برطانوی راج شامل ہیں

ہزارہ ڈویژن کے بڑے شہروں میں ایبٹ آباد، مانسہرہ اور ہری پور شامل ہیں ایبٹ آباد کا نام برطانوی افسر جیمز ایبٹ کے نام پر رکھا گیا جس نے 1853 میں اس شہر کی بنیاد رکھی مانسہرہ کا نام مغل بادشاہ اکبر کے جرنیل راجہ مان سنگھ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ہری پور کا نام سکھ جرنیل ہری سنگھ نلوا کے نام پر ہے

برطانوی راج کے دوران ہزارہ ایک اہم سرحدی علاقہ تھا اور یہاں کی مقامی آبادی نے مختلف اوقات میں مزاحمت بھی کی تقسیم ہند کے بعد، ہزارہ پاکستان کا حصہ بن گیا مجموعی طور پر ہزارہ کی تاریخ خواہ وہ لوگوں کے حوالے سے ہو یا خطے کے جدوجہد، ہجرت، ثقافتی تنوع اور مشکل حالات میں بھی ترقی کی ایک کہانی ہے ہزارہ نام کی اصل کے بارے میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں ایک مقبول نظریہ یہ ہے کہ یہ نام 14ویں صدی کے آخر میں امیر تیمور کے دور میں یہاں آباد ہونے والے اس کے فوجی دستوں سے منسوب ہے جنہیں "ہزارہ کارلغ" کہا جاتا تھا یعنی کارلغ ترکوں کا ایک ہزار سپاہیوں پر مشتمل دستہ ایک اور ممکنہ ماخذ کے مطابق یہ نام قدیم سنسکرت نام "ارسا" یا "اراشا" سے ماخوذ ہے

یہ علاقہ تاریخی طور پر پہلے "پکھلی" کے نام سے جانا جاتا تھا برطانوی راج کے دوران یہ پنجاب کا حصہ رہا اور 1901 میں جب شمال مغربی سرحدی صوبہ (موجودہ خیبر پختونخوا) تشکیل دیا گیا تو اسے ایک ضلع کا درجہ دیا گیا

ہزارہ کو ضلع سے ترقی دے کر ڈویژن کا درجہ 1976 میں دیا گیا یہ اقدام اس وقت کی حکومت نے انتظامی بنیادوں پر کیا تھا1976 میں پاکستان کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو تھے لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی حکومت کے دور میں ہزارہ کو ڈویژن کا درجہ ملاہزارہ: خوبصورتی اور تاریخ کا سنگم ہزارہ ڈویژن، جس کا دل ایبٹ آباد ہے، پاکستان کے ان خطوں میں سے ایک ہے جو اپنی قدرتی خوبصورتی اور تاریخی اہمیت کے باعث ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ سرسبز پہاڑ، دلکش وادیاں اور پرسکون ماحول اسے سیاحوں کے لیے ایک مرغوب ترین مقام بناتے ہیں۔

قدرتی حسن کی بات کریں تو ہزارہ کسی جنت سے کم نہیں۔ نتھیا گلی، ایوبیہ، کاغان اور ناران جیسی خوبصورت وادیاں اسی خطے کا حصہ ہیں۔ یہاں کے بلند و بالا پہاڑ، گھنے جنگلات، اور صاف وشفاف جھیلیں دیکھنے والوں کو مسحور کر دیتی ہیں۔ موسم گرما میں یہاں کی خنک ہوا اور سبزہ زار روح کو تازگی بخشتے ہیں، جبکہ سردیوں میں برف کی چادر اوڑھ لینے کے بعد یہ علاقہ ایک اور ہی دلکش منظر پیش کرتا ہے یقینی طور پر، ہزارہ کے علاقے میں کئی خوبصورت آبشاریں موجود ہیں جو دیکھنے کے لائق ہیں۔ ان میں سے کچھ مشہور آبشاریں یہ ہیں:

* سجیکوٹ آبشار(Sajikot Waterfall): یہ ایبٹ آباد کے قریب حویلیاں تحصیل میں واقع ایک مشہور آبشار ہے۔ یہ ایک بڑی آبشار ہے جس کے نیچے ایک قدرتی تالاب بنا ہوا ہے اور یہ سرسبز و شاداب ماحول میں گھری ہوئی ہے۔

* امبریلا آبشار(Umbrella Waterfall): یہ آبشار بھی ایبٹ آباد کے قریب واقع ہے اور اپنی منفرد شکل کی وجہ سے مشہور ہے، جو ایک چھتری کی مانند دکھائی دیتی ہے۔ یہاں تک پہنچنے کے لیے کچھ پیدل سفر کرنا پڑتا ہے، لیکن اس کی خوبصورتی تمام تھکاوٹ دور کر دیتی ہے۔

* نوری آبشار(Noori Waterfall): یہ آبشار بھی ہزارہ کے دلکش مناظر میں سے ایک ہے۔

* ہزارہ آبشار(Hazara Waterfalls) جَب ویلی: حال ہی میں دریافت ہونے والی یہ آبشاریں ہری پور کے قریب جَب ویلی میں واقع ہیں۔ یہاں آٹھ چھوٹی بڑی آبشاریں ایک سلسلے کی صورت میں موجود ہیں، جو اپنی

قدرتی خوبصورتی کی وجہ سے سیاحوں کو تیزی سے اپنی طرف متوجہ کر رہی ہیں۔ ان آبشاروں کے علاوہ بھی ہزارہ کے مختلف حصوں میں چھوٹی بڑی کئی دلکش آبشاریں پائی جاتی ہیں جو اس خطے کی خوبصورتی کو مزید بڑھاتی ہیں یقینی طور پر، ہزارہ ڈویژن میں کئی اہم شہر واقع ہیں، جن میں سے کچھ بڑے شہر یہ ہیں:

* ایبٹ آباد: یہ ہزارہ ڈویژن کا صدر مقام ہے اور ایک اہم سیاحتی مرکز ہے۔ یہ شہر اپنی خوبصورت فضا اور تعلیمی اداروں کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔

* مانسہرہ: یہ ایک بڑا تجارتی شہر ہے اور کاغان وناران جانے والے سیاحوں کے لیے ایک اہم پڑاؤ ہے۔ یہاں سے شاہراہ قراقرم بھی گزرتی ہے۔

* ہری پور: یہ ایک صنعتی شہر ہے اور یہاں کئی اہم صنعتی یونٹس قائم ہیں۔ یہ اسلام آباد کے قریب واقع ہے۔

* بٹگرام: یہ ایک پہاڑی ضلع کا صدر مقام ہے اور یہاں کے قدرتی مناظر بہت دلکش ہیں۔

* پٹن (لوئر کوہستان): یہ لوئر کوہستان کا اہم شہر ہے۔

* داسو (اپر کوہستان): یہ اپر کوہستان کا مرکزی شہر ہے۔

* جُدبہ (تورغر): یہ ضلع تورغر کا ہیڈکوارٹر ہے۔

* الائی: یہ وادی الائی کا اہم علاقہ ہے

* کولائی: یہ کولائی پالس کا اہم قصبہ ہے

یہ ہزارہ ڈویژن کے کچھ بڑے اور اہم شہر ہیں ایبٹ آباد اور ہزارہ کے علاقے میں مختلف ذاتیں (اگرچہ یہاں قبیلے کی اصطلاح زیادہ عام ہے) آباد ہیں۔ ان میں سے کچھ اہم یہ ہیں

اہم قبیلے:

* عباسی: ڈھونڈ عباسی بھی ہزارہ کے کچھ حصوں میں پائے جاتے ہیں ایبٹ آباد، ہری پور وغیرہ ڈھونڈ کٹر عباسی ہوتے ہیں ان کی ایک اور قسم سوپر عباسی کھلائی جاتی ہے ان کی مادری زبان ہند کو ہے

جدون: یہ ایک بڑا قبیلہ ہے جو ایبٹ آباد اور اس کے گرد و نواح میں آباد ہے کچھ لوگ انہیں پشتون نسل سے بھی جوڑتے ہیں، لیکن ان کی مادری زبان ہند کو ہے

تھنولی(Tanoli): یہ قبیلہ بھی ہزارہ کے اہم قبائل میں سے ایک ہے جو ایبٹ آباد، ہری پور اور مانسہرہ کے علاقوں میں پایا جاتا ہے

اعوان: یہ قبیلہ بھی ہزارہ کے مختلف حصوں میں آباد ہے

گجر: گجر برادری بھی اس علاقے میں موجود ہے

کرلال(Karlal): یہ قبیلہ زیادہ تر ایبٹ آباد ضلع میں آباد ہے ان کی مادری زبان ہند کو یا پہاڑی ہوتی ہے

سید: سادات کرام بھی اس علاقے میں آباد ہیں

سواتی: سواتی قبیلے کے لوگ بھی ہزارہ میں موجود ہیں

روایات:

ہزارہ کی ثقافت ایک مخلوط ثقافت ہے جس پر مختلف نسلی گروہوں کے اثرات ملتے ہیں یہاں کی کچھ عام روایات درج ذیل ہیں:

* ہند کو زبان: اس علاقے میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہند کو ہے اس زبان کا اپنا ادب اور لوک داستانیں ہیں ہر علاقے میں ہند کو مختلف طریقوں سے بولی جاتی ہے کچھ اس کو نرمی سے بولتے ہیں تو کچھ کے بولنے کا لہجہ سخت ہوتا اس کو میٹھی بولی بھی کہا جاتا ہے

مہمان نوازی: ہزارہ کے لوگ اپنی مہمان نوازی کے لیے جانے جاتے ہیں مہمانوں کا گرمجوشی سے استقبال کیا جاتا ہے خود دیکھ کھانے کو ہو یانہ لیکن مہمان کی مہمان نوازی میں کوئی کمی نہیں آنے دیتے

شادی بیاہ کی رسومات: یہاں شادی بیاہ کی اپنی مخصوص رسومات ہیں جن میں علاقائی روایات کا رنگ نمایاں ہوتا ہے جب کسی کے شادی کے دن رکھے جاتے ہیں تو گاؤں کے سب لوگ اور رشتہ دار مل کر شادی والے گھر جاتے ہیں جہاں سب مل کر گانے اور ٹپے گاتے ہیں ساتھ چند لوگ لوڈو، کیرم بورڈ وغیرہ کھیلتے ہیں اس کے بعد مہندی، بارات اور ولیمہ کیا جاتا ہے

جرگہ: ان علاقوں میں مسائل کے حل کے لیے جرگہ کا نظام اب بھی کسی حد تک موجود ہے یہ لوگ عدالت سے زیادہ جرگہ کو ترجیح دیتے ہیں جہاں ان کے گاؤں کے بزرگ اور جرگہ کے اہم لوگ بیٹھ کر دونوں طرف کی بات کو سنتے ہیں اور آپس میں بات کر کے مسائل کا حل نکالتے ہیں

لوک موسیقی اور رقص: ہزارہ میں لوک موسیقی اور رقص کی بھی اپنی روایت ہے، جس میں مقامی ساز اور دھنیں شامل ہیں "کمار" یہاں کا ایک روایتی رقص ہے جو ڈھول کی دھن کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے

لباس: یہاں کے لوگوں کا روایتی لباس بھی علاقائی ثقافت کی عکاسی کرتا ہے مرد حضرات کمیز، شلوار، کے ساتھ کھیڑی، ویسکوٹ اور ساتھ رومال یہ چادر اوڑھتے ہیں

عورتیں کمیز شلوار کے ساتھ سر پر ڈوپٹے لیتی ہیں

کھانے: ہزارہ کے روایتی کھانوں میں مقامی اجزاء اور ذائقے شامل ہوتے ہیں لیکن مکئی کی روٹی اور اس کے ساتھ سرسوں یہ لسی کا ساغ یہاں کا روایتی کھانا ہے

مجموعی طور پر، ایبٹ آباد اور ہزارہ ایک کثیر الثقافتی خطہ ہے جہاں مختلف قبائل اور برادریاں صدیوں سے مل جل کر رہ رہی ہیں اور اپنی منفرد روایات کو برقرار رکھے ہوئے ہیں ایبٹ آباد تعلیمی لحاظ سے بھی ایک اہم

مرکز ہے۔ یہاں کئی نامور تعلیمی ادارے موجود ہیں جو ملک بھر سے طلباء کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ان اداروں نے اس شہر کو ایک علمی اور ثقافتی مرکز کی حیثیت بھی عطا کی ہے۔

تاہم، حالیہ برسوں میں اس خطے کو کچھ چیلنجز کا بھی سامنا رہا ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی اور سیاحت کے باعث قدرتی وسائل پر دباؤ بڑھ رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ترقی کے ساتھ ساتھ ماحول کے تحفظ کو بھی یقینی بنایا جائے تاکہ اس خطے کی خوبصورتی اور قدرتی دولت کو برقرار رکھا جا سکے۔

مجموعی طور پر، ایبٹ آباد اور ہزارہ ایک ایسا خطہ ہے جو اپنی دلکش مناظر، تاریخی اہمیت اور پرسکون ماحول کی وجہ سے ایک خاص پہچان رکھتا ہے یہ پاکستان کا ایک ایسا گوشہ ہے جو نہ صرف سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے بلکہ یہاں کے باسیوں کے لیے بھی ایک پرامن اور خوبصورت مسکن فراہم کرتا ہے۔ اس خطے کی قدرتی خوبصورتی اور ثقافتی ورثے کو محفوظ رکھنا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔

# ایک عکس ہماری حقیقتوں کا (محنت کا سفر)

عتیقہ بتول

زندگی ایک مسلسل سفر ہے، جو چھوٹے چھوٹے لمحوں اور فیصلوں سے بنتی ہے۔ ہم روزانہ صبح اٹھتے ہیں، دفتر یا اسکول جاتے ہیں، گھر کے کام کرتے ہیں، لوگوں سے ملتے ہیں، اور شام ڈھلنے پھر ایک نئے دن کے لیے تیاری کرتے ہیں۔

ہم اکثر بڑے خواب دیکھتے ہیں، بڑی کامیابیوں کے خواب۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان خوابوں کی تعبیر انہی چھوٹے چھوٹے کاموں میں چھپی ہوتی ہے جو ہم روز کرتے ہیں۔ وقت پر اٹھنا، اپنے کام کو ذمہ داری سے انجام دینا، دوسروں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنا، یہ سب معمولات ہی ہماری کامیابی کی بنیاد بنتے ہیں۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمیں لگتا ہے کہ "اصل زندگی" تو کہیں اور ہے— کسی بڑے موقعے یا کسی کامیابی کے بعد۔ مگر یہ سوچ ہمیں موجودہ لمحے کی خوبصورتی سے محروم کر دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی وہی ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہے، جو ہم جی رہے ہیں۔

ایک طلبہ کی زندگی روزمرہ کی زندگی کا سب سے اہم دور ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ دور بظاہر آسان لگتا ہے۔

ہر طالب علم کی صبح جلدی اٹھنے سے شروع ہوتی ہے۔ چاہے اسکول ہو یا کالج یا پھر یونیورسٹی وقت کی پابندی اولین شرط ہے۔ کلاسز، لیکچرز، اسائنمنٹس اور گروپ پراجیکٹس جیسے کئی کام دن بھر مصروف رکھتے ہیں۔ ایک طرف پڑھائی کا دباؤ، تو دوسری طرف مستقبل کے بارے میں بے چینی۔ یہ سب ایک طالب علم کی زندگی کو الجھائے رکھتے ہیں۔

طلبہ کی زندگی کا ایک پہلو وہ خواب اور امیدیں بھی ہیں جو وہ اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ وہی اصل امتحان ہے۔ سوشل میڈیا، دوستوں کی مصروفیات، اور دیگر تفریحات کے درمیان اپنا وقت پڑھائی کے لیے نکالنا کسی چیلنج سے کم نہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ، بہت سے طلبہ کو مالی مشکلات، گھریلو یا جذباتی مسائل کا بھی سامنا ہوتا ہے۔ مگر یہی وقت ہے جب وہ زندگی کے سبق سیکھتے ہیں خوداعتمادی، وقت کی قدر، اور سب بڑھ کر صبر۔ ایک کامیاب طالب علم وہی ہوتا ہے جو روزمرہ کے ان چھوٹے چھوٹے چیلنجز کا سامنا ہمت اور حکمت سے کرتا ہے۔

روزمرہ زندگی دراصل ہمیں صبر، شکر، محبت اور محنت سکھاتی ہے۔ یہ ہمیں بتاتی ہے کہ کامیابی صرف کسی بڑے مقصد کے حاصل ہونے کا نام نہیں، بلکہ راستے میں اٹھائے گئے ہر درست قدم کا بھی نام ہے۔

اگر ہم چاہیں تو معمولی لمحوں کو بھی خاص بنا سکتے ہیں۔ اپنوں کے ساتھ وقت گزارنا، کسی غریب کی مدد کرنا، یا راستے میں کسی کو مسکرا کر سلام کرنا۔ یہ سب چھوٹے چھوٹے عمل ہماری زندگی کو بہتر اور خوشگوار بنا سکتے ہیں۔

آیئے، اپنی روزمرہ زندگی کو بوجھ سمجھنے کے بجائے اسے اپنے آپ کو سنوارنے کا ذریعہ بنائیں۔ کیونکہ یہی زندگی ہے۔

# آج کے معاشرہ میں ریڈیو کی اہمیت

از قلم عطاالودود

آج کی دنیا میں موبائل فون کمپیوٹر اور ٹیبلٹ جیسے جدید آلات موجود ہیں لیکن اکثر لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ ریڈیو اب بھی کیوں موجود ہے۔

ریڈیو 1980 کی دہائی میں اپنی ایجاد کے بعد ایک طاقتور آلہ رہا ہے۔ ٹیکنالوجی میں ترقی کی بدولت، ریڈیو میں مزید بہتر خصوصیات آچکی ہیں۔ جسکے نتیجے میں یہ ہماری روزمرہ زندگی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ آج ہم اس عنوان پہ گفتگو کریں گے کہ کیوں ریڈیو اب بھی اہم ہے؟

اس میں سب سے پہلی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ریڈیو بہت سے لوگوں کی پہنچ میں ہے۔اور تقریبا تمام گھروں اور دفاتر پر کم از کم ایک براڈ کاسٹ ریسیور موجود ہوتا ہے.

مزید بر آں یہ گھر سے دور بھی استعمال کیا جاسکتا ہے جیسا کہ جاگنگ کے دوران آفس میں یا آفس جاتے ہوئے۔ یہ ابلاغ عامہ کے سب سے ذیادہ استعمال ہونے والے آلات میں سے ہے۔ ٹیلی ویژن، اخبارات اور موبائل فونز کے مقابلے میں ریڈیو سر فہرست ہے۔ یونیسکو کی رپورٹ کے مطابق تقریبا 44،000 ریڈیو اسٹیشن تقریبا پانچ بلین افراد تک معلومات نشر کرتے ہیں جو دنیا کی 70 فیصد آبادی بنتی ہے۔ ریڈیو ہر ایک تک معلومات پہنچانے کا سب سے جمہوری زریعہ ہے۔ مثال کے طور پر مختلف کمیونیٹیز کے لیے ریڈیو اسٹیشنوں کا انتظام اور انکا کنٹرول مقامی لوگ کرتے ہیں۔ اور اسی بنا پر وہ شراکت داری کے لیے وقتاً فوقتاً مختلف تجاویز پیش کرتے رہتے ہیں ۔ ریڈیو کی ایک اور اہم بات یہ ہے کہ یہ اپنے سننے والوں کو انکے مذہب، تعلیمی سطح، مالی حیثیت،، قبیلے، نسل یا جنس سے بالاتر ہو کر آزادی دیتا ہے. اسکے علاوہ کچھ ممالک میں مختلف بولیاں یا زبانیں موجود ہیں۔ اور ان زبانوں اور بولیوں کو دوام بخشنے کے لیے علاقائی زبانوں میں ریڈیو کی خدمات موجود ہیں۔ ریڈیو موسیقی سے محظوظ ہونے کا بھی اہم ذریعہ ہے۔ اور اس بات سے ہم سب واقف ہیں کہ موسیقی صدیوں سے تفریح کا اہم ذریعہ ہے۔

یہ ہمارے موڈ کو بہتر بناتی ہے۔اور مختلف حالات سے نمٹنے میں مدد کرتی ہے۔حالیہ برسوں میں تحقیق سے ایک اور بات بھی ثابت ہوئی ہے کہ موسیقی تھراپی کے طور پر بھی کام کر سکتی ہے۔جسمانی صحت کے شعبے سے تعلق رکھنے افراد اس مہارت کا استعمال مریضوں کو پریشانی، تناؤ، ڈیمنشیا وغیرہ سے لڑنے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔ہم مختلف آلات کے توسط سے روز موسیقی سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔جو ہمارے موسیقی سننے کے تجربے کو مزید تقویت بخشتی ہے، مزید یہ کہ بلیوٹوتھ ٹیکنالوجی آپ کو اپنے ٹیبلٹ، کمپیوٹر یا موبائل فون پر گانے بجانے کی سہولت فراہم کر کے تفریح میں اضافے کرتی ہے۔

بعض اوقات ہمیں گھر میں یا گھر سے باہر وقت گزارنے کی ضرورت ہوتی ہے، اور چونکہ ہمیں ہر جگہ انٹرنیٹ کی سہولت میسر نہیں ہوتی، خاص طور پر دور دراز جگہوں پر۔ایسے تمام مقامات پر بھی ریڈیو بہترین کام کرتا ہے اور موسمیاتی تبدیلیوں کا اس کی کارکردگی پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ایک جیبی سائز کا ریسیور جس کی بیٹری اس کے اندر ہی موجود ہوتی ہے، لہذا اس کا محدود ما حصل ہے، اور آپ کو اسے استعمال کرنے کے لیے بجلی کے ضرورت نہیں ہے، اور دیہی علاقوں میں جاتے وقت آپ کچھ اضافی بیٹریاں اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔کچھ نئ طرز کے ریڈیوز میں بیٹری کی سطح کا پیمانہ موجود ہوتا ہے جس سے استعمال کرنے والا بیٹری کم ہو جانے سے بروقت مطلع ہو جاتا ہے اور بلا تعطل استعمال کی غرض سے بیٹری تبدیل کر سکتا ہے۔

بلاشبہ بجلی کے آلات کا ہماری زندگی میں اہم کردار ہے لیکن زیادہ دیر تک اسکرین پر نظریں جمائے رکھنے کے بھی بہت منفی اثرات ہوتے ہیں۔یہ موٹاپا، نیند کے مسائل، اضطراب، اور کمر اور گردن کا شدید درد کا باعث بن سکتا ہے۔ریڈیو آپکو الیکٹرانکس پر زیادہ وقت گزارنے سے بچاتا ہے، اور یہ آپکی صحت کے لیے بہت بہتر ہے۔بھلے آپ نے خبریں سننی ہوں یا موسیقی آپ کہیں بھی کبھی بھی کچھ بھی سن سکتے ہیں۔ایک اور اہم نقطہ جو کسی بھی طرح سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا وہ یہ ہے کہ یہ دوسرے الیکٹرانک آلات سے سستا ہے۔اسکی تیاری کی لاگت ٹیلیویژن اور دیگر بصری مواد بنانے کے برعکس کم ہے۔اور بجلی کی قیمت بھی کم ہے۔آپ کو محض بیٹری کی ضرورت ہے اور آپ کہیں بھی جانے کے لیے تیار ہیں۔

نیٹ ورک ٹاور کے سگنل اکثر سخت موسم، سورج کی حدت اور تکنیکی خرابی کی وجہ سے تعطل کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن ریڈیو ہر قسم کی قدرتی آفات میں بھی بھرپور کام کرتا ہے۔ اور سامعین کو موسم کی بدلتی صورتحال سے وقتاً فوقتاً باخبر رکھتا ہے۔ آج کے دور میں ریڈیو بہت مضبوط بہت ترقی یافتہ شکل میں موجود ہے اور اس میں جدت آنے کے باعث یہ لوگوں کا انتخاب بھی ہے۔ یہ آپکو پوری دنیا سے باخبر رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کے یہ قدرتی آفات کی صورت میں بھی کام کرتے ہیں۔ اور یہ ریڈیو تو وہاں بھی کام کرتا ہے جہاں بجلی اور موبائل سگنل جیسی سہولت بھی میسر نہ ہو۔ اور یہ دور دراز علاقوں میں معلومات فراہم کرنے کا بہت اہم ذریعہ ہے۔ یہ حالت جنگ میں معلومات اور حالت امن میں تفریح طبع کا بہترین ذریعہ اور کارآمد آلہ ہے استعمال کے حوالے سے۔

# گلیات کی خوبصورتی

فائزہ عباسی

پاکستان قدرتی حسن سے مالا مال ایک ایسا ملک ہے جس کے ہر کونے میں قدرت کے دلکش رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ انہی حسین علاقوں میں "گلیات" ایک ایسا مقام ہے جو نہ صرف ملکی سیاحوں بلکہ غیر ملکی سیاحوں کے لیے بھی کشش کا مرکز ہے۔ "گلیات" دراصل "گلی" سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب چھوٹے راستے یا وادیاں ہیں، اور یہ علاقہ ایبٹ آباد اور مری کے درمیان واقع ہے۔ نتھیا گلی، ڈونگا گلی، خانسپور، چھانگلہ گلی اور ایوبیہ اس کے مشہور مقامات میں شامل ہیں۔ گلیات کی سب سے بڑی خوبی اس کا سرسبز و شاداب ماحول، قدرتی جنگلات، ٹھنڈی ہوائیں، پرندوں کی چہچہاہٹ اور بلند و بالا پہاڑ ہیں۔ یہاں کی ہوائیں نہ صرف جسم کو راحت دیتی ہیں بلکہ روح کو بھی تازگی بخشتی ہیں۔ صبح کی دھند میں لپٹی پہاڑیاں اور سورج کی پہلی کرنوں سے روشن ہوتے مناظر، کسی خواب سے کم نہیں لگتے۔ نتھیا گلی گلیات کا سب سے خوبصورت مقام مانا جاتا ہے۔ یہاں کی سبزیاں، پھل، اور مقامی ثقافت سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ پہاڑی راستوں پر واک کرنا، چھوٹے چھوٹے چشموں کا پانی پینا، اور ٹھنڈی ہوا میں بیٹھ کر قدرت کو محسوس کرنا ایک ایسا تجربہ ہے جو ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ گلیات نہ صرف موسم گرما میں پُرکشش ہوتی ہے بلکہ سردیوں میں جب یہاں برفباری ہوتی ہے، تو یہ علاقہ برف کی سفید چادر اوڑھ لیتا ہے۔ برف پوش درخت، ٹھنڈی ہوائیں، اور پرسکون ماحول، اسے ایک جادوئی دنیا میں تبدیل کر دیتا ہے۔ بدقسمتی سے، سیاحت میں اضافہ کے ساتھ ساتھ کچھ منفی اثرات بھی سامنے آرہے ہیں جیسے کہ ماحولیاتی آلودگی، جنگلات کی کٹائی اور بے ہنگم تعمیرات۔ ہمیں چاہیے کہ ہم گلیات جیسے خوبصورت علاقوں کی حفاظت کریں، وہاں صفائی کا خاص خیال رکھیں اور مقامی کمیونٹی کی مدد سے ماحولیاتی توازن کو برقرار رکھیں۔ آخر میں بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ گلیات قدرت کا ایک ایسا تحفہ ہے جو ہماری توجہ، محبت اور حفاظت کا مستحق ہے۔ اگر ہم اس کی خوبصورتی کو قائم رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں ذمہ دار شہری بن کر اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔

# جنت کے راستے یا جنت کا راستہ؟ شاہراہِ قراقرم پر سفر کا ایک حقیقت پسندانہ جائزہ

حسینہ اعظم

کہتے ہیں کہ گلگت بلتستان کی وادیاں زمین پر جنت کا منظر پیش کرتی ہیں۔ سرسبز پہاڑیاں، برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں، نیلگوں ندیاں اور خاموش فضائیں۔

مگر اگر آپ نے واقعی ان حسین مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی ٹھان لی ہے تو ذرا سنبھل جایئے کیونکہ اس خوابناک سفر کے دوران آپ کا سامنا جنت کے نظاروں سے پہلے خود جنت کی طرف سفر کے خطرے سے بھی ہو سکتا ہے۔ چلاس سے گلگت اور پھر سکردو جانے والی سڑکیں جنہیں 'شاہراہ قراقرم' اور 'سکردو روڈ' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ دنیا کی خطرناک ترین شاہراہوں میں شمار ہوتی ہیں۔ یہاں کی سڑکیں اس قدر تنگ ہیں کہ ایک طرف سے اگر ٹرک آجائے تو دوسری طرف آنے والی گاڑی کے مسافروں کو اپنی سانسیں روک کر دعا کرنی پڑتی ہے۔ بارش ہو یا برفباری، ان راستوں پر سفر کرنا گویا اپنی جان اللہ کے حوالے کرنے کے مترادف ہے۔ صرف 2023 میں شاہراہِ قراقرم پر 270 سے زائد ٹریفک حادثات رپورٹ ہوئے جن میں 80 سے زائد قیمتی جانیں ضائع ہوئیں۔ جہاں سڑکیں خستہ حال ہیں وہیں عوامی ٹرانسپورٹ کا حال اس سے بھی زیادہ افسوسناک ہے۔ یہاں کی بسیں نہ تو ایئرکنڈیشن ہوتی ہیں نہ محفوظ۔ بعض بسوں کے دروازے سفر کے دوران خود بخود کھل جاتے ہیں اور کچھ کی ونڈ اسکرینیں ٹوٹ کر راہگیروں کو سلامی دیتی ہیں۔

2024 میں ایک افسوسناک واقعہ پیش آیا جب ایک بس تلچی پل کے قریب بریک فیل ہونے کے باعث دریائے سندھ میں جا گری۔ نتیجتاً 14 افراد موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے جبکہ 12 اب تک لاپتہ ہیں۔ یہ حادثہ کسی اچانک قدرتی افتاد کا نہیں بلکہ مسلسل نظرانداز کی جانے والی حفاظتی خامیوں کا نتیجہ تھا۔

لیکن یہاں مسئلہ صرف سڑکوں یا گاڑیوں کی خستہ حالی تک محدود نہیں۔

جب بھی عوام یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ "ہماری سڑکیں کیوں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں؟" یا "ہماری بسیں موت کے کنویں کیوں بنی ہوئی ہیں؟" تو سیاستدان فوری طور پر فرقہ واریت کا کارڈ کھیل کر اصل مسائل سے توجہ ہٹا دیتے ہیں۔ معمولی تنازعات کو بڑھا چڑھا کر لسانی اور فرقہ وارانہ رنگ دیا جاتا ہے تاکہ عوامی سوالات دب جائیں۔ حال ہی میں گلگت شہر میں ہونے والا ایک معمولی جھگڑا پورے علاقے میں فرقہ واریت کی آگ بھڑکانے کی واضح مثال ہے۔ حالات یہ ہیں کہ اگر آپ ذاتی گاڑی میں اس سفر پر روانہ ہونا چاہتے ہیں تو ہر پرزہ، ہر بریک اور ہر ٹائر بہترین حالت میں ہونا لازم ہے۔

ان خطرناک موڑوں پر ذراسی لاپرواہی آپ کو یا تو دریائے سندھ کے بیچوں بیچ پہنچا سکتی ہے یا کسی کھائی کی تہہ میں۔ یہاں اگر گاڑی خراب ہو جائے تو دھکا لگانے سے زیادہ دعاؤں سے امید باندھی جاتی ہے۔ تاہم، اگر آپ نے ان تمام خطرات، سیاسی بے حسی اور سماجی سازشوں کے باوجود ہمت کر کے شاہراہ قراقرم کے خطرناک راستوں کو عبور کر لیا تو آپ کو واقعی وہ جنتی نظارے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کو ملیں گے جن کا خواب آپ نے دیکھا تھا۔۔۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ زندہ سلامت۔

# پاکستان پر ماحولیاتی تبدیلی کے اثرات: چیلنجز، حکمت عملی

جواہر احمد

ماحولیاتی تبدیلی بہت سے ممالک کے لیے ایک بڑا چیلنج بن چکی ہے، اور پاکستان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ پاکستان ان ممالک میں شامل ہے جو ماحولیاتی تبدیلی کے اثرات کے لحاظ سے سب سے زیادہ خطرے میں ہیں۔ جس کی وجہ سے اس ماحولیاتی تباہی نے اور اقتصادی چیلنجز کو جنم دیا ہے۔ اس کے پہلے سے ہی نازک معیشت دباؤ میں ہے، ملک میں پانی کی شدید قلت، زراعت، اور دیگر اقتصادی شعبے جیسے انرجی، صحت، اور غذائی تحفظ سب ہی متاثر ہو رہے ہیں۔ ملک کے زرعی شعبے پر اس تبدیلی کے منفی اثرات بہت گہرے اور خطرناک حد تک بڑھ چکے ہیں۔

ماحولیاتی تبدیلی نے نہ صرف انسانی زندگیوں کو خطرے میں ڈالا ہے بلکہ یہ ایک بڑی سماجی اور معاشی چیلنج بھی بن چکی ہے۔ غیر متوقع طریقے سے ماحولیاتی تبدیلیوں کا عمل تیز رفتار ہو چکا ہے، جس کے اثرات ہمیں شدید گرمی، غیر متوقع بارشوں، سیلابوں، خشک سالی، اور گلیشیئرز کے تیزی سے پگھلنے کی صورت میں دکھائی دے رہے ہیں۔ پاکستان کو ان خطرات کا سامنا ہے، کیونکہ نہ صرف ماحولیاتی تبدیلی کے خلاف کوئی مضبوط پالیسی موجود ہے، بلکہ اس کے خلاف عملی اقدامات کی بھی کمی ہے۔ ہمیں فوری طور پر ایک ایسی جامع حکمت عملی کی ضرورت ہے جو نہ صرف ماحولیاتی تبدیلی کے بڑھتے ہوئے خطرات کا سامنا کرے بلکہ اس کے ساتھ ان سے نمٹنے کی بھی حکمت عملی رکھتی ہو۔

پاکستان کو صرف ماحولیاتی تبدیلی کے بڑھتا ہوا سامنا نہیں بلکہ اس کے ساتھ میں بھی ترقی کرنی ہے۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب ہم ماحولیاتی تحفظ کو اپنی قومی ترجیحات میں شامل کریں۔ حکومت کو چاہیے کہ ماحولیاتی تبدیلی کے خلاف مضبوط پالیسیز بنائی جائیں، جن پر عملدرآمد بھی یقینی بنایا جائے۔ یہ بات بھی زور دینا ضروری ہے کہ اگر پاکستان کی کاربن ایمیشنز کی طرف سے مسئلہ کچھ حد تک کم ہے، لیکن اس کے اثرات کہیں زیادہ ہیں۔ ہمیں

ماحولیاتی تبدیلی کی عالمی نوعیت کو سمجھتے ہوئے عالمی سطح پر کام کرنا ہو گا، تاکہ ہم کسی بھی ممکنہ خطرات سے بچ سکیں۔ماحولیاتی تحفظ کے لیے قومی سطح پر تحقیق، عوامی شعور، اور پالیسی کی ہم آہنگی کی ضرورت ہے۔

پاکستان میں ماحولیاتی تبدیلی کے اثرات متعدد پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں، جو ملک کے سماجی، اقتصادی، اور سیاسی منظرنامے کو بھی متاثر کر رہے ہیں۔ مختلف ماحولیاتی تبدیلیوں کے اہم اثرات میں مختلف قدرتی آفات کی شدت میں اضافہ شامل ہے۔ جس سے نہ صرف جانی نقصان کا خطرہ بڑھتا ہے بلکہ اقتصادی ترقی پر بھی منفی اثر پڑتا ہے۔

اس صورتحال میں پاکستان کو فوری طور پر ایک جامع اور موثر قومی حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ جس میں ماحولیاتی تبدیلی کے چیلنجز، ان کے متوقع نتائج، اور ان کے تدارک کی کوششیں شامل ہوں۔

لہٰذا، اب وقت آچکا ہے کہ ہم ماحولیاتی انصاف اور جدوجہد کی اہمیت کو اپنائیں کریں۔ یہ تبدیلی تب ہی ممکن ہے جب حکومت، سوسائٹی کے تمام طبقات، اور ہر شہری اس عمل میں شامل ہوں۔ پاکستان ان چند ممالک میں شامل ہے، جسے ماحولیاتی تبدیلی کے سنگین اثرات کا سامنا ہے۔ ہمیں فوری طور پر اقدامات کرنا ہوں گے تاکہ ہم نہ صرف ماحولیاتی خطرات سے نمٹ سکیں بلکہ ایک محفوظ، پائیدار، اور خوشحال مستقبل کی بنیاد رکھ سکیں۔[مہک اخلاق]

چولستان کینال منصوبہ سندھ اور پنجاب کے درمیان ایک تنازع کی شکل اختیار کر رہا ہے بہت سی ملکی پارٹیوں نے اس منصوبے کے خلاف احتجاج کرنے پر اتفاق کیا ہے صدر آصف علی زرداری کی زیر صدارت ہونے والے اجلاس میں اس منصوبہ کی منظوری دی گئی۔

حکومت سندھ کے ایک نمائندے نے اس پر اعتراض کیا تو وفاقی حکومت نے اسے مسترد کر دیا۔ یہ منصوبہ چولستان کو سیراب کرنے کی ایک کوشش ہے ماہرین مسلسل یہ آواز اٹھا رہے ہیں کہ سیلابی پانی نہ آنے کی صورت میں پنجاب کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جس سے دریائے سندھ میں پانی کی مقدار کم ہو جائے گی ماہرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ باقی دریاؤں کی نسبت دریائے سندھ میں پانی کی کمی ہے۔ماہرین نے اس حد تک پیشگوئی کی ہے کہ

اگر یہ منصوبہ کامیاب نہ ہوا تو دریائے سندھ محض ریت کے ٹیلوں کا منظر پیش کرے گا۔ سندھ کے وزیر اعلیٰ مراد علی شاہ کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے کمیٹیوں میں اس منصوبہ کے بارے میں جامع موقف پیش کیا تھا مگر ان کے موقف کو مسترد کر دیا گیا۔ چولستان کینال دراصل دریائے ستلج کے سلیمانکی بیراج سے نکالی جائے گی، جو فورٹ عباس پر اختتام پذیر ہو گئی۔ یہ نہر 176 کلو میٹر طویل ہو گی۔ اس نہر سے 120 کلو میٹر طویل ماروٹ کینال کو پانی مہیا کیا جائے گا۔ یہ پانی East ward مشرق کی طرف منتقل ہو گا۔

اس نہر سے چولستان کی 452،000 ایکڑ زمین جو صحرائی علاقہ میں ہے سیراب ہو گی، اس علاقے میں پانی فراہم کرنے کے لیے 524 کلو میٹر ڈسٹری بیوٹرز اور چھوٹی چھوٹی نہریں تعمیر ہو گی۔ اس منصوبہ پر 21 بلین روپے کی لاگت آئے گی۔ یہ منصوبہ اس طرح ڈیزائن کیا گیا ہے کہ 3 اپ اسٹریم دریا کو منسلک کر کے نہروں رسول قادر آباد، قادر آباد بلوکی اور بلوکی سلیمانکی کو بھی پانی ملے گا۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انڈس ریور سسٹم اتھارٹی کے جنوری 2024 اجلاس میں جب اس منصوبہ کو پانی کی دستیابی کا سرٹیفکیٹ دینے کا معاملہ آیا تو حکومت سندھ کے نمائندے نے یہ قانونی سوال اٹھایا کہ اتھارٹی اس نوعیت کا سرٹیفکیٹ جاری کرنے کا اختیار ہی نہیں رکھتی مگر اتھارٹی کے اجلاس میں 1 کے مقابلے میں 4 ووٹوں سے یہ سرٹیفکیٹ جاری کرنے کا فیصلہ ہوا تھا۔

ماہرین اپنے آرٹیکل میں مسلسل یہ سوال اٹھا رہے ہیں کہ جب سیلابی پانی میسر نہیں ہو گا تو پھر اتنی خطیر رقم سے تیار ہونے والی ہنر میں پانی کہاں سے آئے گا؟ یہ توقع کی جاتی ہے کہ سیلابی پانی نہ آنے کی صورت میں پنجاب میں سے کچھ پانی چولستان کینال کو منتقل کرے گا مگر جب پنجاب میں پانی کی قلت ہو گئی تو پھر کیا ہو گا؟ اخبار میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ سے پتہ چلا ہے کہ پلاننگ کمیشن نے حکومت پنجاب سے اس بارے میں تفصیلات مانگی تھی تاکہ نئے کینال سسٹم میں پانی کی مقدار کا فارمولا طے کیا جائے۔

# نیو ورلڈ آرڈر اور ہم (پاکستان)

ثقلین مشتاق

مستقل عنوان: دھند

سیاسی و معاشی مفادات کا آپس میں ٹکراؤ، بحرانوں کے گرد چکر کاٹتا یہ عالمی نظام، معاشی بحرانوں سے نکلتے نکلتے سیاسی بحرانوں کا شکار ہو جاتا ہے جس سے گلوبل نارتھ اور ساؤتھ نکل نہیں پا رہے یوں اس ٹرانزیشنل فیز کے دوران نئے بلاک بنتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جس کی بنیاد معاشی مفادات پر ہے۔

پاکستان بھی انہی مسائل سے دوچار ہے۔ اندرونی و بیرونی چیلنجز کا شکار یہ ملک معاشی استحکام لانے کی سر توڑ کوششیں کر رہا ہے۔ وزیر اعظم شہباز شریف کے دورۂ ترکی، سعودیہ عرب یا بیلاروس کو ہی دیکھ لیں ان بیرونی دوروں کا مقصد ملک کو معاشی بحرانوں سے نکالنا اور سفارتی سطح پر بہتر تعلقات کی راہ ہموار کرنا ہے جیسا کہ ہم نے دیکھا وزیر اعظم کی دورہ بیلاروس کے موقع پر تجارت اور معاشی تعاون سے متعلق کئی یادداشتوں پر دستخط ہوئے۔ معاشی بحرانوں سے نکلنے کیلئے اقدامات ضروری ہیں۔ ایک طرف بیرونی سرمایہ کاروں کو متوجہ کرانے کی کوششیں جاری ہیں تو دوسری جانب جلد بازی میں کئے گئے فیصلے ملک کے اندر سیاسی بحرانوں کو جنم دے رہے ہیں۔

بیرونی سرمایہ کاری کا ذکر ہو اور ایس آئی ایف سی کا ذکر نہ ہو ایسا تو ہو نہیں سکتا۔ SIFC (سپیشل انوسٹمنٹ فیسلیٹیشن کونسل کا قیام بیرونی سرمایہ کاروں کو سہولیات فراہم کرنے کیلئے عمل میں آیا جس کا مقصد ease of doing business کو فروغ دینا ہے لیکن یہاں ایس آئی ایف سی کی پالیسیز میں ایک کمی نظر آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے، SIFC زمینی حقائق سے آگاہ نہیں ہے، جس کا اندازہ کے پی منرل اینڈ مائنز ایکٹ 2025 پڑھ کر ہوا۔ سٹیک ہولڈرز کو اعتماد میں لئے بغیر کوئی بھی پراجیکٹ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔ مقامی لوگوں کو نظر انداز کرنے کے نتائج دیکھنے ہیں تو CPEC کو ہی دیکھ لیں، بڑے پیمانے پر منصوبے شروع کریں تو غلطی یا غفلت کی گنجائش باقی نہیں رہتی کیونکہ یہ طویل مدتی منصوبے ہیں۔ کوئی بھی بیرونی سرمایہ کار شارٹ ٹرم بزنس کیلئے انوسٹمنٹ نہیں

کرے گا۔ پاکستان اور چین کے مابین معدنیات کی تلاش کیلئے میمورینڈم سائن ہوا جس کے تحت چائنیز گلگت بلتستان میں معدنیات کی تلاش کیلئے پہلے سروے کریگا لیکن وزیر اعظم شہباز شریف صاحب نے اس سے پہلے ہی دعویٰ کیا کہ گلگت بلتستان کے پہاڑوں میں کھربوں ڈالرز کی معدنیات موجود ہے جبکہ سروے ابھی ہوا۔ اس منصوبے کا اعلان SIFC کے پلیٹ فارم سے ہوا، یہاں بھی اسٹیک ہولڈرز کو اعتماد میں نہیں لیا گیا اور گلگت بلتستان کی متنازعہ حیثیت کو یکسر نظر انداز کیا گیا۔ اس وقت گلگت بلتستان میں عوامی ایکشن کمیٹی واحد فورم ہے جن کو عوامی تائید حاصل ہے۔ عوامی ایکشن کمیٹی کے رہنماؤں کی گرفتاری پر پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے بھی تشویش کا اظہار کیا ہے۔

پاک بھارت کشیدگی نے اندرونی اختلافات میں یقیناً کمی لائی ہے جیسا کہ سندھ میں کینال کے معاملے پر عوامی رد عمل، بلوچ یکجہتی کونسل کے رہنماؤں کو قید کرنے کے بعد کے حالات نظام یا وفاق کے خلاف دھرنے و احتجاج۔، ادھر پختونخوا اور گلگت بلتستان میں مائنز اینڈ منرل ایکٹ 2025 کے حوالے سے عوامی تحفظات، یہ وہ زمینی حقائق ہیں جن سے پردہ پوشی زیادہ دیر تک ممکن نہیں۔ قومی مفادات کی خاطر پالیسی سازوں کو چاہیئے ان مسائل پر نظر ثانی کریں۔

یہ سیاسی و سماجی بحرانوں سے نکلنے کا بہترین موقع ہے۔ اس کو موقع غنیمت جان کر فایدہ اٹھایئے۔

ایک نیا ورلڈ آرڈر کا نظام دنیا میں نافذ ہونے جا رہی ہے۔ اس بدلتے ہوئے ورلڈ آرڈر میں اپنی جگہ بنانے کے لیے ہمارے ارباب اختیار کو چاہیئے، ان شکایات کا ازالہ کیا جائے۔ قومی سطح پر یکجہتی ہو، حکومتی علاقائی اور طبقاتی سطح پر حقیقی نمائندوں کو نظام میں شامل کر کے اس خلا کو پر کرنے میں ہی نظام کی بھلائی ہے۔

# مانسہرہ—ایک خواب، ایک حقیقت

کبریٰ وقار

شمالی پاکستان میں واقع مانسہرہ وہ خطہ ہے جہاں قدرتی حسن، تاریخی ورثہ، سیاسی حرارت، اور تعلیمی بیداری ایک ساتھ جلوہ گر ہیں۔ یہ ضلع نہ صرف سیاحوں کے لیے جنت ہے بلکہ اہلِ فکر و نظر کے لیے تحقیق کا میدان بھی۔ مانسہرہ کی تاریخ ہمیں بدھ مت کے عظیم فرمانروا اشوکا کے دور تک لے جاتی ہے۔ آج بھی "اشوکا کی لاٹ" مانسہرہ کے دامن میں کھڑی ہے، جو اس علاقے کی قدامت اور تہذیبی اہمیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ مقام نہ صرف تاریخ دانوں بلکہ سیاحوں کی بھی دلچسپی کا مرکز ہے۔

اگر بات کی جائے قدرتی حسن کی، تو مانسہرہ بلاشبہ پاکستان کا تاج ہے۔ ناران، کاغان، شوگران، جھیل سیف الملوک اور بابوسر ٹاپ جیسے مقامات دنیا بھر کے سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ وادیاں سبز، ہوا خنک، اور پانی شفاف—یہی مانسہرہ کی پہچان ہے۔

سیاسی لحاظ سے بھی مانسہرہ ایک متحرک ضلع ہے۔ یہاں کی عوام سیاسی طور پر بیدار اور جمہوری عمل میں بھرپور حصہ لیتی ہے۔ مختلف ادوار میں مسلم لیگ (ن)، تحریکِ انصاف اور جمعیت علماء اسلام نے یہاں سے کامیابیاں حاصل کیں۔ حالیہ انتخابات میں بھی مانسہرہ کے حلقے قومی سطح پر اہم ثابت ہوئے۔

مانسہرہ میں تعلیم کا فروغ بھی قابلِ ستائش ہے۔ ہزارہ یونیورسٹی جیسے ادارے نوجوان نسل کو نئی راہیں دکھا رہے ہیں۔ خواتین کی تعلیم کی شرح میں اضافہ اور نوجوانوں کی ٹیکنالوجی کی جانب رغبت، اس علاقے کی روشن مستقبل کی نوید ہے۔ البتہ مسائل بھی ہیں۔ سڑکوں کی حالت، صحت کی سہولیات اور سیاحتی انفراسٹرکچر کی کمی وہ رکاوٹیں ہیں جو اس ضلع کی مکمل صلاحیت کو بروئے کار آنے سے روکتی ہیں۔ اگر حکومت اور نجی شعبہ اس جانب توجہ دے تو مانسہرہ صرف خیبر پختونخوا کا ہی نہیں، پورے پاکستان کا چمکتا ستارہ بن سکتا ہے۔ مانسہرہ صرف ایک ضلع نہیں، ایک مکمل تجربہ ہے—تاریخ کا، فطرت کا، شعور کا اور امید کا۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس خواب کو حقیقت میں بدلیں، تاکہ آنے والی نسلیں بھی اس جنت کو دیکھ سکیں، سمجھ سکیں اور سنوار سکیں۔

# خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے

## مشرف سلیم

آج ہم دیکھ سکتے ہیں کہ پوری دنیا میں فلسطین کے حق میں نعرے بلند کیے جا رہے ہیں لیکن افسوس کہ غزا کی آبادی ختم ہونے کے قریب ہے۔ دوسری جانب بڑی طاقتیں اپنے سیاسی اور ملکی مفادات کی وجہ سے خاموش ہیں۔ کسی کی زبان کسی کے قرض کے بوجھ کے نیچے دبی ہوئی ہے اور کسی کے ہاتھ کسی کے احسان سے بندھے ہوئے ہیں۔56 مسلم ممالک ہونے کے باوجود بھی فلسطین کے مسلمانوں کی جانوں سے زیادہ امریکہ کے ساتھ اپنے اچھے تعلقات کو زیر نظر رکھا جا رہا ہے جبکہ دوسری جانب وہی امریکہ اپنے تعلقات کو اسرائیل کے ساتھ ساری دنیا میں اس طرح واضح طور پر دکھا رہا ہے جیسے مظلوم فلسطین نہیں اسرائیل ہو اور اگر اس معاملے کو انسانیت کی نظر سے دیکھا جائے تو لوگ مختلف اشیاء کا بائیکاٹ کر رہے ہیں جس میں وہ الٹا اسرائیل کو ہی فائدہ پہنچا رہے ہیں کیونکہ میرے خیال سے اسرائیل کی بنائی گئی اشیاء کو خرید کر ضائع کرنا کوئی عقلمندی نہیں۔ اس سے اسرائیل کو ہی فائدہ پہنچانے والی بات ہے کیونکہ ان کی چیزیں بکنا بند نہیں ہو رہی بلکہ زیادہ بکنا شروع ہو گئی ہیں۔ اسرائیل کو تو اپنی اشیاء بیچنے سے مطلب ہے بے شک ہم ان ایشیا کو خرید کر ضائع ہی کیوں نہ کر دے اس سے اسرائیل کی ہی معیشیت مزید مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔ نہ جانے مسلمان ہو کر بھی ہم ابھی تک اس جنگ کو ختم نہیں کر پائے اور نہ جانے ہم اس وقت کا انتظار کر رہے ہیں کہ یہی کیفیت ہم پر گزرے ہمارے اور ہمارے بچوں کے جسموں سے لہو کی بوندیں گرے تو شاید ہمیں اس بات کا احساس اور اندازہ ہو جائے کہ انسانی خون اور انسانی جان سے زیادہ قیمتی چیز اس دنیا میں کوئی نہیں۔ شاید جب ہمارے اپنے بچوں کی چیخ و پکار کی آوازیں ہمارے کانوں میں سے گزریں پھر ہمیں احساس ہو کہ فلسطین کے بچوں کی آوازیں بھی اتنا ہی معنے رکھتی ہیں جتنا کہ ہمارے اپنوں کی ان کی بھی جانے اتنی ہی قیمتی ہیں جتنی ہمارے اپنے بچوں کی، ابھی حال ہی میں بھارت اور پاکستان کی جنگ کی باتیں ساری دنیا میں سنی گئیں اور جو کچھ ہوا وہ سب دیکھا گیا۔ بھارت نے بزدلوں کی طرح کئی دفعہ رات کے اندھیرے میں پاکستان پر وار کیا لیکن ہمیشہ کی طرح پاکستان نے اپنے پرچم اور قوم کے وقار دونوں کو ہی سربلند رکھا اور یہ یقین دلوایا کہ جب تک افواج پاکستان ہمارے سرحدوں پر موجود ہے ہم سکون اور چین کے نیند سوسکتے ہیں۔ لیکن ایک

وقت ایسا بھی آیا کہ جب مجھے فلسطین اور اس کے لوگوں کی لاچاری کا اندازہ ہوا جس وقت بھارت نے چھپ کر پاکستان پر حملہ کیا اور لوگ اپنے بچوں کو لے کر اپنے ہی گھر میں ایک جگہ پر اکٹھے ہو گئے اور خوف ہر طرف طاری ہو گیا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ خوف اور ڈر کس بلا کا نام ہے۔ لیکن شاید اب تو فلسطین والے بھی 56 مسلم ممالک سے امید کا دامن چھوڑ بیٹھے ہیں اور شاید انہیں بھی اب خدا کی بے آواز لاٹھی کا انتظار ہے جو محشر کے دن اسرائیل جیسے ظالموں کی پکڑ کرے گی اور بالا آخر یہ جنگ اپنے اختتام کو پہنچے گی۔ مجھے کبھی اب ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ ہم انسان لالچ کے اس موڑ پر آ چکے ہیں جہاں ہم اپنی ذات کے علاوہ دوسروں کو دیکھ ہی نہیں سکتے، ہمیں اپنے مفادات اور اپنی ہی ذات سے مطلب ہے، جس جگہ مطلب پرستی کا ڈیرا لگ جائے وہاں انسانیت کم ہی نظر آتی ہے اور احساس کا پرندہ انسانیت سے بہت دور پرواز کر جاتا ہے۔ انسانیت کے ناطے ہمارا یہ فرض بنتا ہے کہ ہم قدم بقدم اپنے مسلمان بہن اور بھائیوں کے ساتھ ایسے کھڑے ہوں کہ ہمارے درمیان میں سے ہوا کا جھونکا بھی نہ گزر سکے۔ ہم سب میں ایسا اتفاق ہو کہ کوئی مسلمانوں پر آنکھ اٹھانے سے پہلے ہزار بار سوچے۔ ہمارے درمیان ایسی مضبوطی ہو جو کہ دنیا کی کوئی بھی طاقت نہ توڑ پائے۔ شیعہ، سنی وہابی، ہونے کی لڑائی سے باہر آ کر یک مسلمان ہو کر ایک ساتھ کھڑے ہوں تو کوئی بھی مصیبت مسلمانوں کی جانب اپنا قدم نہیں بڑھا سکتی۔ آخر میں دل سے یہی دعا ہے کہ پروردگار اپنے غیب کے خزانوں سے فلسطین کی مدد فرمائے اور بھیجے امام مہدی کو جو ظلم کے گلے میں حق کی زنجیر ڈالیں اور نہ کہ صرف فلسطین بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کو ظالموں کی قید اور غلامی سے آزادی دلوائیں اور ہر جانب حق کا بول بالا ہو، امام آئیں اور ان کی حکومت ہو، ہر طرف خوشحالی ہو، امیر اور غریب کے لیے انصاف ایک جیسا ہو تاکہ کوئی بھی انسان اس بات پر امادہ نہ ہو کہ انصاف کے سارے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو چکے ہیں۔

# پاکستان بھارت جنگ ایک تاریخی، جذباتی اور تعمیری جائزہ

اوریم ارشاد

پاکستان اور بھارت کا رشتہ قیامِ پاکستان کے دن سے ہی کشیدہ رہا ہے۔ برصغیر کی تقسیم 1947 میں صرف سرحدوں کی نہیں بلکہ جذبات، رشتوں، اور تہذیبوں کی بھی تقسیم تھی۔ یہ دو ممالک، جو کبھی ایک ہی دھرتی کا حصہ تھے، وقت کے ساتھ ساتھ کئی بار آمنے سامنے آئے، خصوصاً میدانِ جنگ میں۔ جنگیں، اگرچہ قوموں کی تاریخ کا حصہ بنتی ہیں، لیکن ان کے زخم نسلوں تک محسوس کیے جاتے ہیں۔

قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی جموں و کشمیر کا تنازع دونوں ممالک کے درمیان کشیدگی کا بنیادی سبب بن گیا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کا بھارت سے الحاق، کشمیری عوام کی خواہشات کے برخلاف تھا۔ پاکستان نے کشمیری مسلمانوں کی حمایت میں اقدام کیا، جس پر بھارت نے افواج بھیج کر قبضہ جما لیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب دونوں ملکوں کے درمیان جنگ چھڑی، جو 1948 میں اقوامِ متحدہ کی مداخلت سے وقتی طور پر ختم ہوئی۔ لیکن اس جنگ نے ایک مستقل مسئلہ کشمیر کو جنم دیا، جو آج تک دونوں ممالک کے تعلقات کو زہر آلود کرتا آرہا ہے۔

1965 کی جنگ پاکستان اور بھارت کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن مرحلہ تھی۔ یہ جنگ بنیادی طور پر کشمیر کے مسئلے پر لڑی گئی، اور دونوں طرف سے شدید جانی و مالی نقصان ہوا۔ پاکستانی قوم نے فوج کے ساتھ یکجہتی کا مظاہرہ کیا، اور بہادری کی داستانیں رقم ہوئیں۔ راوی، چناب اور سیالکوٹ کے محاذوں پر دشمن کے حملے روکے گئے، اور پوری قوم نے اس جنگ کو "دفاعِ وطن" کا فریضہ سمجھ کر لڑا۔ اس جنگ کے بعد تاشقند معاہدہ عمل میں آیا، لیکن دونوں ممالک کے درمیان اصل مسائل جوں کے توں رہے۔

1971 کی جنگ، شاید سب سے دلخراش واقعہ تھا۔ مشرقی پاکستان میں پیدا ہونے والی سیاسی بے چینی کو بھارت نے اپنے فائدے میں استعمال کیا، اور مکتی باہنی کی مدد سے اندرونی بغاوت کو ہوا دی۔ اس کے نتیجے میں

پاکستان کو دولخت ہونا پڑا، اور بنگلہ دیش ایک الگ ملک بن کر ابھرا۔ یہ جنگ پاکستان کے لیے صرف جغرافیائی نقصان نہیں بلکہ نفسیاتی صدمہ بھی تھی۔ اس جنگ نے ہمیں یہ سبق دیا کہ داخلی اتحاد اور سیاسی استحکام نہ ہو تو بیرونی دشمن فائدہ اٹھاتا ہے۔

1999 میں کارگل کے محاذ پر دوبارہ جنگ کے شعلے بھڑکے۔ پاکستانی افواج نے بلند چوٹیوں پر قبضہ کر کے بھارت کو حیران کر دیا۔ اگرچہ عالمی دباؤ اور سفارتی صورتحال کی وجہ سے پاکستان کو ان چوکیوں سے دستبردار ہونا پڑا، لیکن اس کارروائی نے دنیا بھر میں کشمیر کے مسئلے کو ایک بار پھر اجاگر کر دیا۔ اس جنگ نے یہ بھی واضح کیا کہ روایتی جنگیں اب صرف میدانِ جنگ تک محدود نہیں رہیں، بلکہ میڈیا، سفارت کاری اور عوامی رائے بھی ایک نیا محاذ بن چکی ہے۔

1998 میں جب دونوں ممالک نے ایٹمی دھماکے کیے، تو جنوبی ایشیا کا منظر نامہ یکسر بدل گیا۔ اب کسی بھی جنگ کے امکانات نہ صرف ان دونوں ممالک بلکہ پوری دنیا کے لیے خطرناک بن گئے۔ دونوں طرف کے عوام، دانشور، اور پالیسی ساز اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ ایٹمی جنگ کا مطلب تباہی ہے۔ اس لیے جنگ کی بجائے مذاکرات، سفارت کاری، اور اعتماد سازی کی کوششیں وقت کی ضرورت ہیں۔

جنگیں تاریخ کا حصہ ضرور ہوتی ہیں، مگر ترقی کا راستہ امن سے ہو کر گزرتا ہے۔ پاکستان اور بھارت دونوں کو اب یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ان کے اصل دشمن غربت، جہالت، بے روزگاری اور انتہا پسندی ہیں۔ اگر جنگ پر خرچ ہونے والے اربوں روپے تعلیم، صحت اور ٹیکنالوجی پر لگا دیے جائیں تو برصغیر دنیا کا ترقی یافتہ خطہ بن سکتا ہے۔ ثقافت، زبان، تاریخ اور رسم و رواج کی مشابہتیں ان دونوں ملکوں کو قریب لا سکتی ہیں۔ کھیلوں، فنونِ لطیفہ، اور عوامی روابط کے ذریعے نفرت کی دیواریں گرائی جا سکتی ہیں۔ کشمیر جیسے پیچیدہ مسئلے کو بھی باہمی افہام و تفہیم، کشمیری عوام کی خواہشات کے احترام، اور سیاسی حکمت عملی سے حل کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان اور بھارت کی جنگیں ہمیں ماضی کا آئینہ ضرور دکھاتی ہیں، مگر یہ آئینہ ہمیں مستقبل سنوارنے کا موقع بھی دیتا ہے۔ ان جنگوں نے ہمیں بہادری، قربانی اور یکجہتی کا سبق دیا، مگر ساتھ ہی یہ بھی سکھایا کہ امن سب سے بڑی کامیابی ہے۔ ہمیں ایک ایسی دنیا کی تعمیر کرنی ہے جہاں جنگیں صرف کتابوں کا موضوع ہوں، اور حقیقت میں امن، بھائی چارہ اور ترقی ہماری پہچان ہو۔

# جدید فیشن اک درد سر

سلمی وحید

فیشن لفظ فیشن ذہن میں اتے ہی سب سے پہلا خیال جدیدیت کا اتا ہے جدیدیت یعنی نئے اقتدار اور طور طریقے اپنانا جدیدیت یعنی پرانی گھسیپٹی روایات سے دامن چھڑا لینا جدیدیت یعنی نئے زمانے کی روشن خیالی سے اپنی زیست میں نئے رنگ بھرنا جدیدیت یعنی ماضی سے جڑے رہنے کی بجائے نیا پن اور نیا انداز اوڑھ لینا جیسے کہ کب سے اپ کا انداز رہا ہے

یہ بدلتی قدریں ہی حاصل زمانہ ہیں
بار بار ماضی کے یوں ورق نہ الٹا کر

لیکن سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ جدیدیت کے معنی و محفوم کتنے وسیع ہیں اور کس کس جگہ پر ان کی ضرورت ہے نوجوان نسل سے پوچھیے تو سب سے پہلے فیشن کے نام پر لباس کی جدت پر بات ہوتی ہے برینڈز کا ذکر اتا ہے پہلے پہل تو یہ جدیدیت لباس صرف خواتین کا شعبہ تھا لیکن اج کا نوجوان صنف نازک کو مات دیتا دکھائی دیتا ہے اور وہ صرف لباس تک محدود نہیں اس کا ہیئر سٹائل اس کے پروڈکٹ اس کے سینڈل گھڑی موبائل غرض یہ کہ ہر شے جدت کی متقاضی ہے صنف نازک تو لباس کی تراش خراش یا پھر چہرے کے ہائیڈرا فیشل وغیرہ تک ہی پہنچ پاتی ہے ابھی وہ بمشکل ایک فیشن کو اپنا ہی رہی ہوتی ہے کہ دوسرا فیشن سر اٹھانے لگتا ہے تو مہکی فضائیں سرگوشی کرتی ہیں

دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا زمانہ کب رکا ہے. ہر جدیدیت کو کچھ ہی وقت کے بعد قدامت بننا ہوتا ہے ازل سے یہی دستور چلا ارہا ہے اور یوں ہی چلتا رہے گا زمانہ جدیدیت کا متلاشی ہے اور اہل زمانہ اس کے تعاقب میں ہیں مگر کیا کبھی اپ نے سوچا کہ اس فیشن جدت نئے پن اور بدلتی قدروں کے چکر میں انسان کی ہستی اس کی شخصیت کی پختگی اس کی ذہانت اس کے احساسات و خیالات و میلانات یہ سب کہاں ہیں.

آج کی نوجوان نسل ہر فیشن کی پیروی کرنا اپنا فرض گردانتی ہے تاکہ کوئی اسے بیک ورڈ یا پسماندہ نہ کہہ پائے لیکن وہ اس بات کا ادراک کرنے سے قطعا کا اثر ہے کہ ہر فیشن ہر شخص پر اچھا نہیں لگتا ہم مشرقی سوچ کے لوگ مغربی اقدار سے فیشن اخذ کرتے ہیں لیکن اپنے معاشرے میں کوئی ہمیں "باغی" کہتا ہے تو کوئی "کوا چلا ہنس کی چال" سوچ کر مسکراتا ہے

ضرورت تو اس امر کی ہے کہ ہم مشرقی لوگ خصوصا خواتین اپنی حدود و قیود حکم مقرر کریں بے شک وہ اقدامات پرستی پر مبنی نہ ہو لیکن کم از کم ہمارے مذہب اور معاشرے کے مطابق ہوں ایسے فیشن جو ہمیں دین کے تقاضوں سے متصادم نہ ہونے دیں جس سے دیکھنے والے نگاہوں میں احترام جھلکے نہ کہ ہوس جاگے. اس بات کا تعین خود خود صنف نازک کو کرنا ہے کیونکہ حیا عورت کا زیور ہے۔

صنفِ نازک پہ متانت کی قبا جچتی ہے

بات سادہ سی ہے، عورت پہ حیا جچتی ہے

اج ہمارے فیشن انڈسٹری میں دیکھیں تو جو جتنا مغرب پرست ہے وہ اتنا ہی ماڈرن سمجھا جاتا ہے ہماری فیشن انڈسٹری کسی طور پر بھی مغرب سے کم نہیں ڈرگز کا استعمال فیشن ہے بے حیائی سے مزین لباس فیشن ہے مخلوط پارٹیز کرنا فیشن ہے فیشن کے دوڑ میں ہم اپنا کلچر اپنا طور طریقہ اور اپنی شناخت سب پیچھے چھوڑے چلے جارہے ہیں

ہمیں سوچنا ہوگا کہ ہم کون ہیں ہم دنیا میں کیوں ائے تھے ہمیں کسی بھی لمحے اپنے اللہ کے سامنے کے پیش ہونا ہے. جیسے یوم الست ہم نے بربکم کہا تھا اس کی مقرر کردہ حدود و قیود کو بلانا نہیں ہے ہمیں زمانے کے ساتھ بھی چلنا ہے فیشن بھی کرنا ہے لیکن فیشن میں اپنی شناخت کو گم نہیں کرنا

کھونا نہیں ہے اپنا کلچر اور اپنی تہذیب کو ساتھ لے کر چلنا ہے تاکہ دنیا جان لے کہ

ہم سے زمانہ خود ہے۔۔۔۔زمانے سے ہم نہیں

# وادی تیراہ

شبیر احمد

وادی تیراہ پاکستان کے صوبہ خیبر پختون خواہ ضلع اور کرزئی میں واقع ایک خوبصورت علاقہ ہے۔ یہ ضلع خیبر پختون خواہ میں ضم ہونے سے پہلے فاٹا کے نام سے جانا جاتا تھا یہ وادی تینوں اضلاع خیبر، کرم اور اور کرزئی کے سنگم میں واقع ایک خوبصورت اور سرسبز علاقہ ہے وادی تیراہ کا ایک چھوٹا سا حصہ افغانستان کے صوبہ ننگرہار کی شمالی سرحد کے ساتھ جاملتا ہے۔ اپنے دلکش قدرتی مناظر، سرسبز وادیاں، بلند پہاڑ اور تاریخی اہمیت کے باعث وادی تیراہ منفرد شناخت رکھتی ہے۔

وادی تیراہ جغرافیائی کے لحاظ سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ تین قبائلی اضلاع کو ملا کر ایک پل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس وادی میں مختلف قسم کے قدرتی اور دلکش مناظر دیکھنے کو ملیں گے جیسا کہ سرسبز پہاڑ کی بلند چوٹیاں، چشمے اور آبشار نظر آئیں گی جو سیاحوں کو اپنی طرف کھینچ لاتی ہے وعدے تیرا کے بلند دو بالا پہاڑوں پر سارا سال برف پڑی رہتی ہے ان پہاڑوں سے کئی چشمے اور ندیاں نکلتی ہیں جو وادی کو سیر اب کر کے سرسبز و شاداب بناتی ہیں۔ وادی تیراہ کے جنوبی حصے میں سرسبز کھیت اور باغات ہیں، جو اس علاقے کی زرخیزی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ موسم گرما میں یہاں کا موسم بہت خوشگوار ہوتا ہے۔ گرمیوں میں اکثر میدانی علاقوں کے لوگ جن میں ٹل، ہنگو، کوہاٹ اور کرک کے لوگ اس وادی کا رخ کرتے ہیں۔ جبکہ سردیوں میں درجہ حرارت منفی میں چلا جاتا ہے۔

وادی تیراہ کی تاریخی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے۔ یہ علاقہ مختلف ادوار میں تہذیبوں اور سلطنتوں کا حصہ رہا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں یہ علاقہ گندھارا تہذیب کا حصہ تھا۔اس کے بعد مختلف مسلمان حکمرانوں نے اس علاقے پر حکومت کی ہے۔ برطانوی دور میں بھی اس وادی نے اہم کردار رہا ہے اور اج بھی برطانوی حکومت کے اثرات نظر اتے ہیں۔وادی تیراہ کی جغرافیائی اہمیت کی وجہ سے ہمیشہ سے ہی ایک اہم تجارتی اور گزر گاہ رہی ہے۔

وادی تیراہ میں پشتونوں کے مختلف قبائل آباد ہیں، جن میں آفریدی، اورکزئی اور شنواری اہم ہیں۔ ان قبائل کی اپنی منفرد ثقافت، روایات اور رسم ورواج ہیں۔ پشتون ثقافت کا ایک اہم حصہ مہمان نوازی بھی ہے اور یہاں کے لوگ اپنے مہمانوں کا گرمجوشی سے استقبال کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں نے آج بھی اپنی ثقافت کو زندہ رکھا ہوا ہے جیسا کہ قبائلی جرگے کا نظام یہاں آج بھی بہت مضبوط ہے، جس کے ذریعے مقامی تنازعات اور مسائل کو باآسانی حل کیا جاتا ہے۔ یہاں کے لوگ سادہ زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کا زندگی کا گزر بسر زیادہ تر زراعت پر جن میں گندم، جو، مکئ اور مختلف قسم کے پھل، سبزیاں اگانے اور مال مویشی پالنے پر ہوتا ہے اور یہی ان لوگوں کا پیشہ ہے۔ وادی تیراہ کا مشہور پھل اخروٹ ہے جو کہ وافر مقدار میں پایا جاتا ہے۔

معدنیات کی بات کی جائے تو یہاں پر مختلف قسم کے معدنی ذخائر پائے جاتے ہیں یہ معدنیات پاکستان کو مالامال کرسکتی ہے۔ اس کے علاوہ وادی کے کچھ حصوں میں جنگلات بھی پائے جاتے ہیں، جہاں سے لکڑی حاصل کی جاتی ہے۔ تاہم پچھلے کچھ سالوں میں امن وامان کی صورتحال کچھ ٹھیک نہیں رہا جن کے باعث یہاں کی معاشی سرگرمیوں پر منفی اثر پڑا ہے۔

اگر یہاں امن وامان اور انفراسٹرکچر کی صورتحال پر توجہ دی جائے تو یہ اپنی قدرتی خوبصورتی اور تاریخی اہمیت کے باعث وادی تیراہ میں سیاحت کا بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔

وادی تیراہ کو پچھلے کئی سالوں سے امن وامان کے مسائل کا سامنا رہا ہے۔ دہشت گردی اور انتہاپسندی کے واقعات نے یہاں کی زندگی کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ جس کی وجہ سے یہاں ترقیاتی کام بھی متاثر ہوئے ہیں۔ لوگوں کو اپنی روزمرہ زندگی میں کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تعلیم اور صحت کی سہولیات کی بھی یہاں کمی ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ ان مسائل پر توجہ دے اور یہاں کے لوگوں کو امن وامان اور بنیادی سہولیات کی فراہمی کو یقینی بنائے۔

امن وامان کی بحالی اور ترقیاتی کاموں کے آغاز کے بعد وادی تیراہ ایک بار پھر خوشحالی کی طرف گامزن ہو سکتی ہے۔ یہاں کے لوگوں میں صلاحیت اور جذبہ موجود ہے، ضرورت صرف ایک سازگار ماحول اور حکومتی

سرپرستی کی ہے۔ اگر یہاں تعلیم اور صحت کے شعبوں میں بہتری لائی جائے اور سیاحت کو فروغ دیا جائے تو یہ وادی نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر کے لوگوں کے لیے ایک پرکشش مقام بن سکتی ہے۔

وادی تیراہ ایک ایسی سرزمین ہے جو اپنی خوبصورتی، تاریخ اور ثقافت کے لحاظ سے ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کی قدرتی خوبصورتی کو محفوظ رکھا جائے، تاریخی ورثے کا خیال رکھا جائے اور یہاں کے لوگوں کو امن، ترقی اور خوشحالی کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ تب ہی یہ وادی ایک بار پھر اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو حاصل کر سکتی ہے۔

# سوشل میڈیا: فائدہ یا نقصان؟

## شہوار گل

ایک وقت تھا جب خبریں اخبارات سے آتی تھیں، دوستوں سے رابطے خطوط کے ذریعے ہوتے تھے اور تصویریں البمز میں قید رہتی تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ سب کچھ ایک چھوٹی سی اسکرین میں سمٹ گیا۔ سوشل میڈیا کے ذریعے میں نے خود فیس بک پر اپنے بچپن کے دوستوں کو ڈھونڈا، انسٹاگرام پر اپنی تصویریں شیئر کیں، اور ٹوئٹر پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سچ پوچھیں تو یہ ایک جادو سا لگتا ہے۔ ایک کلک پر دنیا کی خبریں، دوستوں کی باتیں، اور زندگی کے رنگ سامنے آ جاتے ہیں لیکن جب رات گئے نیند کی جگہ اسکرین لائٹ نے لے لی، جب دوستوں کی پوسٹس نے دل میں حسرتیں پیدا کیں، تب محسوس ہوا کہ شاید ہم سہولت کے ساتھ ساتھ ایک الجھن میں بھی پھنس چکے ہیں۔

سوشل میڈیا ہمیں جوڑتا بھی ہے اور کبھی کبھار ہمیں تنہا بھی کر دیتا ہے۔ یہ معلومات بھی دیتا ہے اور غلط معلومات بھی پھیلا دیتا ہے۔ اصل بات شاید یہ ہے کہ ہم اسے کس طرح استعمال کرتے ہیں–ایک ذریعہ کے طور پر یا ایک زندگی کے طور پر۔

کبھی ہم اپنے جذبات صرف قریبی دوستوں سے شیئر کرتے تھے۔ خوشی ہو یا غم، بات چیت کا دائرہ محدود ہوتا تھا۔ مگر آج، بس ایک کلک پر دنیا سے رابطہ ممکن ہے۔ یہ ہے سوشل میڈیا کا جادو—اور شاید یہی اس کا فریب بھی۔ سوشل میڈیا نے ہمیں آواز دی، پلیٹ فارم دیا، وہ لوگ جو کبھی دنیا سے کٹے ہوتے، آج اپنی بات لاکھوں تک پہنچا سکتے ہیں۔ کسی کی شادی ہو یا کسی کا کاروبار، سب کچھ ہم چند سیکنڈز میں جان لیتے ہیں۔ مگر یہ سہولت، کبھی کبھی زندگی کے سکون کو کھا بھی جاتی ہے۔

ہم روزانہ اسکرول کرتے ہیں، لائکس گنتے ہیں، اور دوسروں کی زندگیوں کو دیکھ کر اپنی کمیاں تلاش کرتے ہیں۔ ہم نے خود کو "ورچوئل" دنیا میں اتنا الجھا لیا ہے کہ "حقیقی" لمحے کہیں پیچھے رہ گئے ہیں۔ گھر میں سب ایک ساتھ بیٹھے ہوتے ہیں، مگر ہر کسی کی نظریں الگ الگ اسکرین پر ہوتی ہیں۔

جہاں سوشل میڈیا نے دنیا بھر کو قریب کیا ہے، وہیں جھوٹ، فیک نیوز، اور نفرت انگیزی بھی عام ہو گئی ہے۔ کوئی بات وائرل ہو جائے تو اس کی سچائی پر کم، اس کے اثر پر زیادہ بحث ہوتی ہے۔ لیکن کیا ہم سوشل میڈیا کو مکمل طور پر نقصان دہ کہہ سکتے ہیں؟ شاید نہیں۔ جیسے چاقو سے پھل بھی کاٹا جا سکتا ہے اور نقصان بھی دیا جا سکتا ہے —ویسے ہی سوشل میڈیا بھی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم اسے کس طرح استعمال کرتے ہیں۔ اگر ہم اسے معلومات، تعلیم، اور مثبت روابط کے لیے استعمال کریں، تو یہ ایک طاقتور ذریعہ ہے۔ مگر اگر یہ ہمیں دوسروں سے کاٹ کر، اندر ہی اندر کھوکھلا کر رہا ہو، تو رک کر سوچنے کا وقت ہے۔

آخر میں، فیصلہ ہمارے ہاتھ میں ہے ہم سوشل میڈیا کے مالک ہیں یا غلام؟

# گلگت بلتستان میں بڑھتی ہوئی بیماریاں اور انکے اسباب۔

سہیل عباس

گلگت بلتستان، جو کبھی اپنی صاف فضا، قدرتی پانی اور خالص خوراک کی وجہ سے صحت مند زندگی کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا، آجکل تیزی سے پھیلتی ہوئی بیماریوں کی لپیٹ میں آرہا ہے۔ اس خطے میں مختلف اقسام کی جسمانی اور مہلک بیماریاں بڑھتی جارہی ہیں، جن کی بڑی وجوہات جدید طرزِ زندگی، غیر معیاری خوراک، عوامی شعور اور حکومتی غفلت ہیں۔

سب سے اہم وجہ غیر معیاری خوراک کا بڑھتا ہوا استعمال ہے۔ یہ ایسی خوراک ہوتی ہے جس میں کیمیکل، مصنوعی کھادیں اور جراثیم کش ادویات استعمال کی جاتی ہیں۔ ایسی غذائیں جسم کے مدافعتی نظام کو کمزور کرتی ہیں اور آہستہ آہستہ سنگین بیماریوں جیسے کہ کینسر، معدے کے امراض اور جگر کے مسائل کو جنم دیتے ہے جو کہ آج کل گلگت بلتستان میں تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اس وقت کوٹہ کا گندم جو گلگت بلتستان میں مل رہا ہے وہ استعمال کے قابل نہیں ہے کیونکہ یہ گندم سڑے ہوا ہے اس سے بدبو آتے ہے گزشتہ دنوں (جی بی) سے شائع ہونے والے رپورٹ کے مطابق اشیائے خوردونوش میں آٹا بھی شامل ہے جو کہ قابل استعمال نہیں ہے اور ایسے خوراک سے زہریلا پن، معدے کی خرابی اور کمزوری جیسے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔

ہمارے مارکیٹ میں گھریلو استعمال کی اشیاء زیادہ تر کاپی اور غیر معیاری ہے۔ مہنگائی کے ستائے عوام سستا سمجھ کر خرید لیتے ہیں جو کہ بیماریوں کا سبب بن رہی ہیں۔ گلگت بلتستان کی زمین زرخیزی میں اپنے مثال آپ ہے لیکن آج کل ہم آسانی کی تلاش میں ہیں نہ خود گندم کاشت کرتے ہے بلکہ جو خالص فروٹ اور ڈرائی فروٹ یہاں پائیں جاتے ہے انکو بھی ہم بھیج کے پیسے بنانے کی کوشش کرتے ہیں ان خطرناک وجوہات کے تدارک کے لیے فوری اقدامات کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے لوگوں میں شعور اجاگر کیا جائے تاکہ وہ جان سکیں کہ کون سی چیزیں ان کی صحت کے لیے نقصان دہ ہیں۔ مقامی سطح پر organic خوراک کی پیداوار بڑھائی جائے تاکہ باہر سے آنے والی

ناقص اشیاء پر انحصار کم ہو۔ حکومت کو چاہیے کہ خوراک کے معیار کی نگرانی والے اداروں کو سخت تلقین کرے کہ وہ اپنا فرائض صحیح سے انجام دے اور ناقص اشیاء فروخت کرنے والوں کے خلاف سخت کارروائی کرے۔

اگر ان مسائل کو نظر انداز کیا گیا تو آنے والے وقت میں گلگت بلتستان کا صحت مند کلچر صرف ایک خواب بن کر رہ جائے گا۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ہم اجتماعی طور پر ان بیماریوں کے خلاف کھڑے ہوں اور اپنی نسلوں کو ایک صحت مند مستقبل دیں۔

# دنیابدل رہی ہے، ہم کب بدلیں گے؟

زہرا حسیب

ایک عام پاکستانی کی سوچ، آج کی دنیاوہ نہیں رہی جو کچھ سال پہلے تھی۔ ہر طرف بے یقینی، جنگوں کی خبریں، مہنگائی، اور خوف کا ماحول ہے۔ کہیں لوگ اپنے گھروں سے بے دخل ہو رہے ہیں، کہیں بھوک سے تنگ آ کر سڑکوں پر آ رہے ہیں۔ ایسے میں ہم پاکستانی بھی اپنے دلوں میں کئی سوال لیے گھوم رہے ہیں: ہمارا ملک کب سنبھلے گا؟ ہمارے حالات کب بدلیں گے دنیا میں آج جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ہمیں بھی متاثر کر رہا ہے۔ روس اور یوکرین کی جنگ ہو یا مشرقِ وسطیٰ کی کشیدگی، ہر چیز کا اثر ہماری معیشت، ہماری روزمرہ زندگی پر پڑتا ہے۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم نے ابھی تک سیکھا نہیں کہ بدلتی دنیا میں کیسے اپنے آپ کو سنوارا جاتا ہے ہمارے ہاں سیاسی لڑائیاں ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں۔ ایک حکومت جاتی ہے، دوسری آتی ہے، مگر عام آدمی کی مشکلات وہیں کی وہیں رہتی ہیں۔ مہنگائی، بے روزگاری، اور مایوسی جیسے سائے ہمارے سروں پر ہر وقت منڈلاتے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے: کیا ہم واقعی اتنے مجبور ہیں؟ کیا ہم خود کچھ نہیں کر سکتے؟ میری نظر میں، ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ہمیں صرف یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ ہم صرف تماشائی بن کر نہیں رہیں گے، بلکہ تبدیلی کے لیے کھڑے ہوں گے

ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے ملک کو صرف سیاستدانوں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑیں۔ تعلیم، محنت، ایمانداری اور شعور کو اپنائیں۔ ہم میں ہر فرد اگر اپنے حصے کا دیا جلائے، تو پورا ملک روشن ہو سکتاہ

دنیا واقعی بدل رہی ہے۔ ہر دن ایک نئی کہانی لے کر آتا ہے۔ لیکن اصل سوال یہی ہے: ہم کب بدلیں گے؟

# آج کا انسان پریشان کیوں؟

زریاب بن طاہر

آج ہم زندگی کا جائزہ لیں تو آج کی زندگی اور ماضی کی زندگی میں ایک وسیع خلیج نظر آتی ہے۔ جدید ترقی نے زندگی کو بلکل ایک نئ صورت دے دی ہے۔ ساری دنیا ایک گلوبل ویلج بن گیا ہے۔ فاصلے اُس طرح کے طویل فاصلے ۔ نہیں رہے جدید ٹیکنالوجی نے ہر شعبہ ہائے زندگی کو مکمل طور پر انقلاب آشنا کر دیا ہے۔ لیکن یہ عام مشاہدہ ہے کہ جدید آدمی ہر گز مطمئن نہیں ہے۔ ہر کوئ ایک عجیب دوڑ میں آندھا دندھ آگے بڑھنے کے چکر میں اپنے آپ کو خوفناک پیچیدگیوں میں دھکیل رہا ہے۔ ایک ایسی دوڑ جس کا کوئ اختتام ہوتا نظر نہیں آتا ہے۔ ہر آدمی دوسرے پر غالب آنے کی تمنا پالے ہوئے ہے۔ مادیت پرستی کے اس خوفناک کھیل نے آدمی کو حیوانی درجے پر لا پھنکا ہے۔ جب ایک آدمی اپنے لیے دو وقت کی روٹی پوری نہ کر سکے تو اس کی پریشانی تو کسی حد تک سمجھ آتی ہے۔ لیکن ایک شخص جو جو چاہے اسانی سے حاصل کر لے اس کے پاس مادی وسائل کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہو لیکن وہ اس پہلے پریشان غریب آدمی سے بھی زیادہ غیر مطمئن اور تذبذب کا شکار ہو تو معاملہ گہرے فکر کا ہے۔ ایک غریب آدمی کی خواہش صرف روٹی تک ہے اور اس کے حصول کے بعد وہ کسی حد تک مطمئن اور آزاد نظر آتا ہے۔ لیکن دولت مند مزید دولت مند بننے کی آرزو میں اپنے آپ کو ہمہ وقت اُلجھائے رکھتا ہے۔ وقت کا پہیہ اپنی رفتار سے چلتا رہتا ہے اور جب زندگی کا درست مفہوم اس کی سمجھ میں آتا ہے تو بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ دراصل مادی خواہشات ایک سنہری زنجیر کی طرح ہیں جس کا کوئ اختتام نہیں۔

# پاکستان کرکٹ کی بلندی اور پستی

عجب صغیر

پاکستان میں کرکٹ ایک کھیل ہی نہیں بلکہ ایک جزبہ اور جنون ہے جو کی ملک کے ہر شخص میں کوٹ کر بھرا ہوا ہے چاہے وہ بچہ ہو بوڑھا ہو یا جوان۔ پاکستان کے ہر گلی محلے میں کھیلنے والے ہر نوجوان کا یہ خواب ہوتا ہے کہ وہ بھی پاکستان کے لیے کرکٹ کھیلے۔ پاکستان میں ٹیلنٹ کی کوئی کمی نہیں مگر بد قسمتی سے وہ سفارشی کلچر کی نظر ہو جاتا ہے۔

اگر ہم پاکستان کرکٹ کی موجودہ صورت حال پر نظر ڈالیں تو مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہو گا۔ ایک زمانہ تھا جب پاکستان کرکٹ اپنے عروج پر تھی انضمام الحق ہو محمد یوسف یا پھر وسیم اکرم اور عمران خان۔ یہ سب وہ نام ہیں جنھوں نے پاکستان کا نام پوری دنیا میں فخر سے بلند کیا۔

اس دوران ہم 1992 کا ورلڈ کپ کیسے بھول سکتے ہیں جب پاکستان ٹیم نے عمران خان کی کپتانی میں پہلا ٹائٹل اپنے نام کیا تھا۔ اور اس کے بعد پھر 2017 میں سرفراز احمد کی کپتانی میں چیمپین ٹرافی اپنے نام کی۔

اس کے بعد پاکستان 2021 کے ورلڈ کپ کے فائنل میں پہنچا مگر شکست ہوہی اور اس کے بعد سے پاکستان کرکٹ کے حالات بہت خراب ہیں

حالیہ 2025 کی چیمپین ٹرافی کی بات کریں تو اس میں پاکستان ٹیم کے کارکردگی نہایت ہی ناقص اور مایوس کن رہی۔ پھر یہی سب ہو گا جب میرٹ کی بجائے ایک سفارشی اور من پسند کھلاڑیوں پر مبنی ٹیم کی سلیکشن ہو گی۔

تو پھر ہم کیسے اچھی کارکردگی کی امید رکھ سکتے ہیں۔ ہماری کرکٹ ٹیم کا ہر 6 ماہ بعد کوچ تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ اگر کوہی لوکل کوچ لائیں تو کھلاڑیوں کے تنازعات ہی ختم نہیں ہوتے اور اس کی بہترین مثال احمد شہزاد اور وقار یونس ہیں آے دن ان کے تنازعات جنم لیتے تھے۔

اس کے برعکس اگر کوئی غیر ملکی کوچ لایا جاتا تو کچھ کھلاڑیوں کو انگریزی زبان سمجھنے میں دشواری پیش آتی تھی۔

جب عمران خان کی حکومت آہی تو انہوں نے دربارہ ریجنل کرکٹ کو بحال کیا جو کی ایک اچھا فیصلہ تھا مگر اس میں بھی ابھی بہت مسائل ہیں۔

ہماری کرکٹ ٹیم میں سلیکشن کا معیار پی ایس ایل پر کیا جاتا ہے اور ٹیسٹ کرکٹ کی سلیکشن بھی پی ایس ایل کی پرفارمینس پر کی جاتی ہے بدقسمتی سے۔ پاکستان کرکٹ بورڈ کے موجودہ چیرمین محسن نقوی نے مکمل چمپئن ٹرافی پاکستان میں کامیابی سے کروائی سوائے بھارت کے تمام ٹیموں نے پاکستان کا دورہ کیا اور اپنے میچز کھیلے۔ اگر اپنی ٹیم کی کارکردگی کی بات کریں تو بہت کی ناقص کارکردگی رہی۔ یہی ہوگا جب میرٹ کی بجائے سفارش پر ٹیم بنے گی۔ بدقسمتی سے جو کھلاڑی ڈومیسٹک کرکٹ میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور کو نظر انداز کے کے اپنے من پسند کھلاڑیوں کو ٹیم میں شامل کیا جاتا ہے اور میرٹ کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں۔

مستقبل میں ہم یہی امید کرتے ہیں کے پاکستان کرکٹ کے حالات بہتری کی طرف جائیں گے اور اگر پاکستان کرکٹ ٹیم اسی کارکردگی کا مظاہرہ کرتی رہی جیسے چمپئن ٹرافی میں کی تو پھر پاکستان کرکٹ کا اللہ ہی حافظ ہے۔

# پاکستان میں نظام تعلیم امیر کے لئے الگ غریب کے لئے الگ

نزاکت علی

پاکستان ایک ترقی یافتہ ممالک میں سے ایک ہے۔ ترقی یافتہ ہونے کا مطلب پاکستان میں تعلیم کو فروغ دینا ہے۔ ہم پاکستان میں نظام تعلیم دیکھیں تو حصول تعلیم علیحدہ علیحدہ ہے۔ امیر کے لئے الگ نظام تعلیم اور غریب کے لئے الگ نظام تعلیم۔ اور اسی طرح اگر ہم بات کریں کی جن اداروں میں تعلیم دی جاتی ہے ان اداروں میں تعلیم نصاب کے مطابق دی جارہی ہے؟ اگر تعلیم نصاب کے مطابق دی جارہی ہے تو ملک ترقی کی راہ ہموار کیوں نہیں کررہی۔ اور اسی طرح جو نظام تعلیم کی علیحدگی کی وجہ سے تعلیم اور جن اداروں سے اچھی تعلیم ملتی ہیں وہاں کے طالب علموں کو جلدی کس نہ کسی اداروں میں نوکری ملجاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ہی ان کے سفارشات بھی ساتھ ہوتی ہے اسلے وہ طالب علم کامیاب ہوتے ہیں۔ اور جو غریب ہوتے ہیں ان کے پاس صرف ڈگری حاصل کرنا اور اپنے پاس رکھنے کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنے گھر اور پورے معاشرے کے لئے بوجھ بنتا ہے۔ اور اسی طرح تعلیم نظام اچھی ہونے کی وجہ سے نہ وہ اپنا وقت ضائع کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے والدین کا پیسہ اور قیمتی وقت بھی برباد ہوتا ہے۔ پاکستان کی بڑی آبادی نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ لاکھوں طلبہ ہر سال کالج اور یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہو رہے ہیں، مگر ان میں سے اکثر یا تو بے روزگار ہیں یا اپنی تعلیم سے غیر متعلقہ ملازمتوں پر مجبور ہیں۔ ایک طرف ملک میں بے روزگاری بڑھ رہی ہے، تو دوسری طرف تعلیم یافتہ افراد کی تعداد بھی۔ یہ ایک واضح تضاد ہے اس کی بنیادی وجہ ہمارا فرسودہ تعلیمی نظام ہے جو محض ڈگریاں بانٹنے کا ذریعہ بن چکا ہے۔ نہ نصاب میں جدت ہے، نہ عملی تربیت۔ ہماری جامعات تحقیق اور اختراع کے مراکز ہونے کے بجائے صرف سندیں جاری کرنے والی فیکٹریاں بن چکی ہیں۔ نتیجتاً، مارکیٹ کی ضروریات اور فارغ التحصیل نوجوانوں کی قابلیت میں واضح فرق موجود ہے

دوسری طرف حکومت کی عدم توجہی بھی اس مسئلے کو مزید سنگین بنا رہی ہے۔ سرکاری نوکریوں کی کمی، نجی شعبے میں غیر یقینی حالات اور کاروباری مواقعوں کا فقدان نوجوانوں کو مایوسی کی طرف دھکیل رہا ہے۔ کچھ ہنر مند اور قابل نوجوان بیرونِ ملک ہجرت پر مجبور ہیں جب تک تعلیم اور روزگار کے درمیان موجود خلا کو ختم نہیں کیا

جاتا، پاکستان کی ترقی ایک خواب ہی رہے گی۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم تعلیم کو صرف ڈگری حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ حقیقی ترقی کا راستہ بنائیں۔

# وزیرستان کے رسم ورواج

شمس وزیر

وزیرستان شمالی پاکستان کا ایک قبائلی علاقہ ہے جو اپنی دلکش قدرتی مناظر، سرسبز و وادیاں، بلند پہاڑ اور تاریخی اہمیت کے باعث وزیرستان ایک الگ پہچان رکھتا ہے وزیرستان جو شمالی وزیرستان اور جنوبی وزیرستان پر مشتمل ہے۔ یہاں پر دو بڑے قبائل رہتے ہیں مثلاً محسود اور وزیر قبائل۔ باقی چھوٹے قبائل بھی رہتے ہیں مثلاً داوڑ، بیٹنی، سلیمان خیل، اور دوتانی قبائل کا دیس بھی ہے۔ واضح بات ہے کہ وزیرستان میں عددی لحاظ سے وزیر قوم کی اکثریت ہے یہاں انگریز حکومت نے دیگر قبائلی علاقوں کی طرح بظاہر انتظامی نظم ونسق کی درستگی کے نام پر وزیرستان کو دو حصوں میں تقسیم کیا ایک کا نام جنوبی وزیرستان اور دوسرے کا نام شمالی وزیرستان رکھا۔ وزیرستان کا علاقہ 1500 مربع کلومٹر پر محیط ہے۔ یہاں کی علاقائی زبان وزیری ہے۔ وزیرستان شمال میں دریائے ٹوچی اور جنوب میں دریائے گومل تک پھیلا ہوا ہے جبکہ مشرق میں ایف آر ڈیرہ اسماعیل خان اور ایف آر ٹانک جبکہ شمال مغرب میں افغانستان کے صوبے خوست اور پکتیکا واقع ہیں

وزیرستان کا زیادہ تر علاقہ کوہستانی ہے۔ ان میں بعض پہاڑوں کی چوٹیاں بہت بلند ہے جس میں کوہ شوئیدر کی اونچائی 11000 فٹ اور پریغل 11600 فٹ بلند ہے۔ وزیرستان کے جنوب مغرب میں منظر بدلتا ہے اور وسیع میدان شروع ہو جاتے ہیں۔ بڑے میدان دومندی کے شمال میں زرمیلان، وانا اور سپین کہلاتے ہیں۔ وزیرستان کے شمال حصے میں لوئر کرم، وادی کھتو، وادی ٹوچی اور وادی خیسورہ ہے ۔

وزیرستان وسیع و عریض علاقے پر پھیلا ہوا ہے۔ مشرقی سرحدیں ٹانک اور بنوں اضلاع کے ساتھ ملحق ہونے کی وجہ سے وزیرستان کے زیریں علاقوں کا موسم گرمیوں میں قدر گرم اور سردیوں میں معتدل رہتا ہے۔ البتہ اس کی مغربی سرحدیں سطح سمندر سے کافی اونچائی پر افغانستان کے ساتھ متصل ہے اس لیے وزیرستان کے بالائی حصوں کا موسم کافی سرد اور خشک ہوتا ہے ان علاقوں میں موسم گرما میں موسم انتہائی اچھا ہوتا ہے مقامی

لوگوں کے لیے اور سیاحت کے لیے مناسب ہوتا ہے گنے جنگلوں کی وجہ سے انتہائی خوبصورت ہوتا ہے موسم گرما میں پہاڑوں میں چشمے بہتے ہیں جس سے پہاڑوں کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہے

شمالی وزیرستان اور جنوبی وزیرستان کے پہاڑوں میں چلغوزہ کافی مقدار میں ہوتا ہے شمالی وزیرستان میں لوگوں کا انحصار تجارت پر ہوتا ہے لیکن یہاں پر زراعت نہ ہونے کے برابر ہے جنوبی وزیرستان کے لوگوں کا زیادہ تر انحصار تجارت اور زراعت پر ہے جنوبی وزیرستان میں ہر سال شجر کاری کا مہم چلایا جاتا ہے ہر سال نئے درخت لگائے جاتے ہیں جنوبی وزیرستان کے پہاڑوں میں چلغوزہ کے علاوہ زیتون کے درخت کافی مقدار میں موجود ہے۔ وانا کے سکولوں میں شجر کاری، باغبانی اور بنجر زمینوں کی آباد کاری کے حق میں ہر سال مہم چلائی جاتی ہے۔ آج وانا کے میوہ جات اور سبزیاں پورے ملک میں مشہور ہیں اور سیزن میں وانا ٹانک روڈ پر میووں اور سبزیوں کے ٹرکوں کے قافلوں کے مناظر قابل دید ہوتے ہیں۔ ایک اہم چیز وزیرستان میں معدنیات کے ذخائر ہیں جن سے مختلف وجوہات کی وجہ سے ابھی تک استفادہ نہیں کیا جاسکا ہے۔ اگر آمن عامہ کی فضا اور مناسب حکومتی رٹ قائم ہو اور عوامی شعور کے سہارے اس سلسلے میں قومی تنازعات پر قابو پایا جاسکے تو نئی نسل کا مستقبل اور وزیرستان کی شہرت معدنیات کے حوالے سے ہو گا۔

وزیرستان میں عید کے موقع پر لوگ لازمی طور پر دو یا تین جوڑے کپڑے سلواتے ہیں اور جوتوں سے لیکر ٹوپی تک مکمل نئے لباس کا اہتمام کیا جاتا ہے عید کے دن گھروں میں مختلف قسم کی خوراک پکائیں جاتے ہیں اور عید کی نماز کے بعد مرد اور خواتین ایک دوسرے کے گھروں میں جا کر کھانے کھاتے ہیں اور عید کا پہلا دن اس طرح گزر جاتا ہے

عید کے دوسرے اور تیسرے دنوں لوگ وزیرستان کے خوبصورت علاقوں میں جاتے ہیں اور لوگ وہاں پر اپنا روایتی اتن یار قص کرتے ہے اور خاص طور پر مکین، رزمک اور وانا میں لوگ گاڑیوں پر ڈرافٹنگ کرتے ہیں اور عید منانے کے لیے لوگ مختلف علاقوں سے آتے ہیں

پہلے دور میں وزیرستان میں پسند کی شادی کی روایت نہیں تھی رشتہ والدین کی مرضی سے طے ہوتا تھا۔ جب کسی کی منگنی ہو جاتی ہے تو بالعموم منگنی اور شادی کے درمیان زیادہ وقفہ نہیں ہوتا ہے اس لیے منگنی کے بعد شادی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ شادی کے دن بوڑھے، جوان مرد اور عورتیں الگ الگ رقص اور گانے گانا شروع کرتے ہیں۔ ڈھول کی آواز سنتے ہی آس پاس کے گاؤں کے نوجوان مستانہ وار پہنچ جاتے ہیں۔ پہلے وقتوں میں شادی تین دن ہوا کرتی تھی اور اج کل دو دن ہوتی ہے۔ اس وقت مرد اور عورتیں ایک ساتھ اتن یار قص کرتے تھے وزیرستان میں شادی موسم بہار اور گرمیوں کے دنوں کی جاتی ہے خوشی کے اس موقع پر عورتوں کو بھی برابر کا موقع ملتا ہے شادی کے بعد دولہا اپنے سسرال اس وقت تک نہیں جاسکتا ہے جب کہ ایک مخصوص قسم کی رسم کی تکمیل نہیں ہوتی۔ یہ رسم مقامی زبان میں "پشہ خلوصائی" کہلاتا ہے جس کی معنی پاؤں کھولنے کے ہیں۔ اس رسم کی ادائیگی کے بعد داماد پر سسرال کے گھر جانے کی مروجہ پابندی ختم ہو جاتی ہے۔ کسی مقررہ تاریخ کو دولہا اپنے چند دوستوں اور گھر کے سرپرست کے ہمراہ سسرال کے گھر جاتا ہے جرگہ ایک روایتی قبائلی عدالتی نظام ہے جہاں قبائلی عمائدین کسی تنازع یا مسئلے کا فیصلہ کرتے ہیں

یہ نظام انصاف، مصالحت اور قبائلی نظم وضبط قائم رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے

پناہ (ناناوتے): اگر کوئی دشمن بھی پناہ مانگ لے تو اسے نقصان نہیں پہنچایا جاتا۔

اگر کسی فرد یا قبیلے کو نقصان پہنچایا جائے، تو وہ بدلے کا حق رکھتا ہے، اور یہ اکثر نسلوں تک چلتا ہے۔

کچھ اور سبق ہم کو زمانے نے سکھائے
کچھ اور سبق ہم نے کتابوں میں پڑھے تھے

چہرہ کھلی کتاب ہے عنوان جو بھی دو
جس رخ سے بھی پڑھو گے مجھے جان جاؤ گے